صائمہ اقبال

اُسی سے عبارتِ تگ و دو

ناولٹ

"اف توبہ اتنی گرمی ادھ موا کر کے رکھ دیا ہے۔ نہ جان چھوڑتی ہے نہ سکون ملتا ہے۔ ہاسپٹل کے ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ تک آنا عذاب ہو جاتا ہے۔"

دھاڑ سے دروازہ کھول کر اس نے اندر قدم رکھا۔ نیم اندھیرے کمرے میں کچھ دیر کے لیے وہ جیسے بینائی سے محروم ہو گئی تھی۔ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ باہر کی نسبت کمرے میں ٹھنڈک تھی۔ شاید اندھیرے کے باعث۔

"مجھے اندر بھیج کر خود اب گھنٹے میں تشریف لائیں گے۔"

باآواز بلند خیالات کا اظہار کرتے اس نے دائیں طرف رکھی کرسیوں کی جانب قدم بڑھائے۔

"باہر قدم بعد میں رکھیں گے پہلے چلتے کولر کو بند کریں گے۔"

کرسی کے پیچھے کولر کے سوئچ کو آن کرتے اس نے اپنے آپ کو کرسی پر جیسے گرا سا دیا مگر کرسی پر بیٹھتے ہی اس کی نظر انتہائی بائیں طرف پڑی کرسی پر بیٹھے شخص پر پڑی اور وہ کرنٹ کھا کر سیدھی ہو گئی۔ دیوار کے ساتھ سر ٹکائے نہ جانے وہ سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ آنکھوں پر لگی کالی عینک سے اسے کچھ بھی پتا نہ چل سکا تھا۔ آنکھیں نیم اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر تھوڑی دیر پہلے کی شرمندگی غصے میں ڈھل گئی۔

"بدتمیز، جاہل، اجڈ۔"

اب کی بار وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی تھی۔ سفید کلف لگے کپڑوں کے ساتھ وہ خود بھی کرسی پر اکڑ ہوا تھا۔

"شاید کپڑوں کے ساتھ اسے بھی کلف لگا ہے۔"

اندھیرے کمرے میں کالی عینک لگائے وہ ایک عجوبہ ہی نظر آرہا تھا۔

"ہر روز نہ جانے کتنے نمونوں سے واسطہ پڑتا انکل کا۔" سامنے رکھی فائل کو کھول کر سامنے کیا۔

"شاید کل والے مریض کی کیس ہسٹری ڈسکس کرنا چاہتے ہیں۔"

دھیان ہٹانے کو اس نے فائل کا مطالعہ شروع کر دیا۔ کام کے اوقات میں اس کی انکل سے بہت ملاقات ہو پاتی تھی۔ اگر انہوں نے اس وقت بلایا تھا ضرور کوئی اہم کام ہو گا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کر دی۔ عینک کے پیچھے سے جھانکتے شخص کو و... چھوڑ کر وہ باہر نکل آئی۔

"مے آئی کم ان سر۔"

دروازہ کھول کر اس نے ذرا سا اندر جھانکا کمرے میں موجود افراد نے سر گھما کر اسے دیکھا آدھا گھنٹا ادھر ادھر پھرنے کے بعد وہ ادھر آئی تھی چشما تو ابھی تک وہیں موجود تھا۔ ڈاکٹر حشمت نے کچھ کہے سر اثبات میں ہلا دیا۔ ان کے دائیں طرف رکھی کرسی پر بیٹھتے اس نے ہاتھ میں پکڑی پنسل گرفت مضبوط کی اور ان کے بولنے کا انتظار کر...

لگی۔

"فیملی والے ڈاکٹر تو وہاں سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے وہ بھوتوں کا مسکن ہو۔ بچوں کے لیے اچھے اسکول نہیں۔ شہری سہولتوں کا فقدان ہے۔"

پہلے اس نے اسے سرسری نظر سے دیکھا تھا اب غور سے دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ آنکھوں پر لگی کالی عینک ہنوز موجود تھی۔ بھرے بھرے ہونٹوں پر کالی مونچھیں گندمی رنگت اور ٹھیٹ پنجابی بولتا وہ شخص شاید ڈاکٹر حشمت سے بے تکلف تھا۔

"کئی بار ڈاکٹر کو دگنی تنخواہوں پر رکھ کر دیکھ لیا مگر کوئی بھی مہینے ڈیڑھ مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتا۔"

ڈاکٹر حشمت پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے شاید وہ اسے وہاں بلا کر بھول چکے تھے۔ اس کے ہاتھ فائل میں رکھے کاغذ پر چلنے لگے۔

"جہالت اتنی ہے وہاں کہ خواتین مرد ڈاکٹروں سے علاج کروانے پر تیار ہی نہیں ہوتیں۔ ٹونکوں اور تعویذ گنڈوں پر اتنا اعتقاد ہے کہ شاید آپ یقین نہ کریں۔"

اس کی بھاری آواز میں تاسف تھا۔

"جہالت تو تمہاری باتوں اور انداز سے بھی ظاہر ہو رہی ہے۔"

اس کے چوڑے چہرے کا اسکیچ پیپر پر بناتے اس نے دل میں سوچا۔

"ہر ڈاکٹر شہر میں ہی کیوں رہنا چاہتا ہے۔ آج تک میں سمجھ نہیں سکا۔"

اس کے گھنے سیاہ بالوں والے سر کو حرکت میں دیکھ کر اسے اس کی کھڑی ناک بنانے میں کچھ دشواری پیش آئی تھی۔

"کیا دیہاتوں میں انسان نہیں بستے۔"

اس کی گھنی مونچھیں بنا کر اس نے غور سے اسکیچ کا جائزہ لیا اور ایک نظر اس کی طرف ڈالی جو حشمت انکل کے ساتھ باتوں میں بری طرح منہمک تھا۔ اسکیچ میں کچھ کمی تھی مگر کیا۔ اس نے ایک بار پھر اسکیچ سامنے کیا ایک نظر اسکیچ پر ڈالی دوسری اس پر۔ اسی دم وہ خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"عینک۔"

ایک دم ہی ذہن میں خیال آیا تھا مگر اس نے اسکیچ بنانا تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیا تھا وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔

"بس اجتماعی احساس کی بجائے انفرادی ترقی ہمارا مطمعٔ نظر بن کر رہ چکی ہے۔ ہم صرف اپنے لیے سوچتے ہیں۔" ڈاکٹر حشمت کی گمبھیر آواز پر وہ ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اسکیچ مکمل ہو چکا تھا۔

"دستور عرف عینک والا جن۔"

اسکیچ کو نام دیتے مسکراہٹ خود ہی اس کے ہونٹوں پر سج گئی۔

"سلویٰ! کچھ دن پہلے میں نے آپ سے دیہات کے ایک ہسپتال کا ذکر کیا تھا۔"

وہ اچانک ہی اس سے مخاطب ہوئے تھے۔ فائل میں رکھا کاغذ جلدی سے گچھ مچھ کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"وہ ہسپتال اسی کا ہی ہے۔ بہت دردمند دل رکھتا ہے تیمور۔ اسے میں بہت عرصے سے جانتا ہوں۔"

"ہاتھ میں پکڑا کاغذ اس نے ٹیبل کے نیچے رکھی باسکٹ میں اچھال دیا مگر وہ باسکٹ میں گرنے کی بجائے لڑھکتا ہوا آگے چلا گیا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ دو سال تمہاری صلاحیتوں اور تجربے میں نکھار پیدا کریں گے۔ تمہیں اکیلے کام کرنے کا موقعہ ملے گا۔ بہت کچھ سیکھنے کا بھی۔ رہائش کا انتظام تیمور کی طرف سے ہو گا۔"

وہ انہیں سن تو رہی تھی مگر زیادہ پریشانی اس گول مول کاغذ کی تھی جو لڑھکتا ہوا عینک والے جن کے عین قدموں میں جا گرا تھا۔ اس نے ٹیڑھی ہو کر میز کے نیچے جھانکنے کی کوشش کی۔

"ڈاکٹر سلویٰ آپ میری بات سن رہی ہیں نا۔"

ڈاکٹر حشمت اسے متوجہ نہ دیکھ کر تھوڑے تیز لہجے میں بولے۔

"جی سر میں سن رہی ہوں۔"

گھبرا کر سیدھا ہوتے اس نے ماتھے پر آئے بالوں کو پیچھے کیا۔

"مجھے امید ہے کہ تمہیں وہاں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ بالفرض ایسا ہوا بھی تو تیمور وہاں موجود ہی ہے۔ بالکل میری طرح تم ان پر اعتماد کر سکتی ہو۔"

"جی سر"

"اگلے ہفتے آپ کو وہاں جوائن کرنا ہے جو بھی تیاری کرنی ہے کر لو میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

اسے آگاہ کرتے انہوں نے اس کے سامنے کھلی فائل اپنی طرف کر لی۔ ڈاکٹر حشمت کے ساتھ باہر نکلتے وقت بھی اس کی نظریں اس کے قدموں میں پڑے گیند سے کاغذ کو تلاش کر رہی تھیں ان کے پیچھے باہر نکلنے سے پیشتر اس نے جھک کر گول مول کاغذ کو اٹھایا کھول کر شکنیں دور کیں اس کا اپنا اسکیچ اس کے سامنے تھا۔

"دستور عرف عینک والا جن"۔

مونچھوں تلے مسکراتے لبوں کے ساتھ کاغذ تہ کر کے اس نے جیب میں ڈال لیا۔

☼ ☼ ☼

"بھائی جان اتنے دنوں کے بعد چکر لگایا ہے آپ نے۔ اس فضول شخص کو کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں۔ بے جی، بابا آپ سب اتنا یاد آ رہے تھے۔ دل ہی نہیں لگ رہا تھا مگر اس بدتمیز کو پھرنے سے ہی فرصت نہیں ہے۔"

فائقہ اس کے ساتھ لگی ضیاء کی شکایتوں میں مگن تھی۔ آخر میں اس کی آواز بھرا گئی اس نے اس کا سر تھپک کر اسے اپنے سے الگ کیا۔

"آئے ذرا کان کھینچتا ہوں اس کے۔ اتنا تنگ کیا ہے اس نے میری منی سی بہن کو۔"

تیمور نے پنک کپڑوں میں ملبوس، پنک چہرے کے ساتھ آنسو بہاتی اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا۔ پچھلے دنوں وہ زمین کے معاملات میں اس قدر مصروف رہا تھا کہ لاہور آنے کی فرصت ہی نہیں مل پائی تھی۔ ضیاء اور فائقہ دونوں جڑواں تھے۔ پنجاب یونیورسٹی میں فائقہ فزکس ڈپارٹمنٹ میں تھی اور ضیاء ایم ایف اے کا طالب علم تھا۔

"ذکوان کیسا ہے اور بھابھی بھیا۔"

سلکی بالوں کو جھلاتے اس نے اپنے اونچے لمبے بھائی کو دیکھا جو چابی میز پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ رہا تھا۔

"سب ٹھیک ہیں تم لوگوں کو یاد کر رہے تھے، بے جی تو کہہ رہی تھیں تم لوگوں کو ساتھ لے کر آؤں۔ بھابھی بھی تیار تھیں آنے کو۔ بس آنے سے کچھ دیر پہلے ہی رفیع بھائی آ گئے تو انہیں رکنا پڑا۔"

گاؤں کے تفصیلی حالات اسے بتا کر اس نے صوفے سے ٹیک لگا لی۔ لاہور کی گرمی نے کچھ ہی گھنٹوں میں اسے نڈھال سا کر دیا تھا۔

"تیمور پتر آیا ہے۔"

ماسی صغریٰ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا حال ہے ماسی۔"

"بالکل ٹھیک ہوں۔ اللہ کا لکھ واری شکر ہے۔"

"پنڈ میں تو سب ٹھیک ہیں نا۔"

ماسی صغریٰ ان کے ساتھ بہت عرصے سے تھیں۔ انہوں نے بھی کبھی ان کو عام ملازموں کی طرح نہ سمجھا تھا بلکہ ان کو گھر کے فرد کی حیثیت حاصل تھی۔ ان دونوں کو لاہور بھیجتے بے جی نے ماسی صغریٰ کو خاص طور

نازیہ کنول نازی

کی شاعری

بچھڑ جانا ضروری تھا

شائع ہو گئی ہے

قیمت ۔۔۔ -/150 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37- اردو بازار، کراچی۔

پر ان کے ساتھ کردیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے پتر آپ آرام کرو میں آپ کے لیے روٹی پانی کا بندوبست کرتی ہوں۔"

"آخر تم اسٹوڈیو کھول کر کرو گے کیا۔"

اپنے سے کئی سال چھوٹے ضیاء کو دیکھتے اس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ بابا اور ضیاء کے درمیان ہونے والی کشیدگی نے سارے گھر کو پریشان کر رکھا تھا۔ بابا اسے اس مقصد کے لیے ایک پیسہ دینے پر تیار نہیں تھے۔ اس کے سوال پر ضیاء کتنی دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"باقی لوگ کیا کرتے ہیں اسٹوڈیو کھول کر۔"

جواب دینے کی بجائے اس نے بھی ایک سوال کردیا۔ لہجے میں گھلی تلخی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے موقف پر قائم ہے۔

"باقی لوگوں کا تو مجھے پتا نہیں ہاں تم ضرور بتاؤ کہ تم کیا کرو گے۔ فیکٹری، زمین سب چھوڑ کر تم لوگوں کی تصویریں بنایا کرو گے۔ شوق کو شوق کی حد تک رکھو تو بہتر ہے۔ پہلے تم نے ایم ایف اے کا کہا بابا نے مان لیا جو تم کہتے رہے وہ سب مانتے رہے مگر اب"

اس نے بہت دنوں کے بعد اس سے اس معاملے پر کھل کر بات کرنے کا سوچا تھا۔ وہ اس کے لاپروا رویئے اور مستقبل کے بارے میں پریشان تھا تو ایسا کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر اس کے ہپیوں جیسے حلیے پر ڈالی بڑھے ہوئے لمبے بال بڑھی شیو گندی بدرنگ جگہ جگہ سے پھٹی جینز کے ساتھ گھریلو چپل پہنے اس کے ہاتھ اور انگلیاں مختلف رنگوں سے مزین تھیں۔

"اب اپنا حلیہ ہی دیکھ لو۔"

ایک گہری نظر اس پر ڈال کر اس نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

"کیا ہوا میرے حلیے کو؟"

اس نے اچنبھے سے اپنے آپ کو دیکھا۔ تیمور نے گہرا سانس لے کر خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی اس کی بات پر ایک دم ہی غبار اس کے سر کو چڑھا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو کنٹرول کیا تھا۔ اسے جلدی غصہ آجایا کرتا تھا مگر اس معاملے کو غصے کی بجائے تحمل سے حل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس نے خود بھی باہر سے تعلیم حاصل کی تھی مگر اس کا حلیہ اسے بھی شرمندہ کردیا کرتا وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے اگر تم اسٹوڈیو ہی کھولنا چاہتے ہو تو میں بابا سے بات کروں گا مگر تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا کہ تم مستقل اس پیشے کو جاری نہیں رکھو گے کچھ عرصے بعد تمہیں رفیع بھائی کے ساتھ فیکٹری کا انتظام سنبھالنا ہو گا۔ یہ اگر تمہارا شوق ہے تو اسے شوق ہی رہنے دو۔"

کوئی بھی جواب دیے بغیر وہ وہیں بیٹھا کچھ سوچتا رہا تھا۔ اسے ضیاء سے بہت محبت تھی اسے پہلی بار اس حلیے میں دیکھ کر حقیقی معنوں میں اسے ایک جھٹکا لگا تھا۔ تصوراتی، خیالی اور ماورائی دنیا اتنی مضبوطی سے اسے اپنے حصار میں جکڑ چکی تھی کہ حقیقی دنیا اور دنیا کی ہر چیز پس پشت چلی گئی تھی۔ بابا اس کے حلیے سے خائف تھے۔ بے جی اسے اپنے گناہوں کی سزا کہا کرتی تھیں گاؤں والوں کے لیے وہ ایک عجوبہ تھا مگر اسے اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔

"بھائی جان مجھے تو لگتا ہے مجنوں میں اور ہمارے بھائی میں صرف اس جینز کا فرق ہو گا۔ وہی بڑے بڑے بال وہی گندے پاؤں وہی بڑھی داڑھی لیکن یہ جینز؟"

فائقہ نے اسے تنقیدی نگاہوں سے دیکھ کر اس پر تبصرہ کیا۔ وہ ابھی ابھی کمرے میں آئی تھی شاید ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کسی حد تک سن بھی چکی تھی۔ فائقہ کے انداز پر ضیاء نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور پھر کسی سوچ میں مگن ہو گیا۔

✫ ✫ ✫

"پتر رب کی مہربانی سے تیری پڑھائی ختم ہو گئی تو نے جو ارادہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا۔ اب دل چاہتا ہے کہ میں بھی اپنی مرضی پوری کروں۔"

وہ یونیورسٹی میں ایم ایس سی میتھس کا اسٹوڈنٹ تھا فقط ایئر کے ایگزام ختم ہوتے ہی اس نے گھر کا رخ کیا تھا اور بے جی اس کے سر ہو گئی تھیں۔ بے جی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ابھی اس کا ایک سال باقی تھا۔ کیسی حسرت بول رہی تھی ان کے لہجے میں۔

"بے جی ابھی میری پڑھائی کا ایک سال باقی ہے۔"

اس نے ان کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

"تو کیا ہوا پڑھتے رہنا بعد میں، منع کون کر رہا ہے تجھے پڑھائی سے۔"

اب کی بار ان کا ارادہ بہت پکا تھا۔

"پتا نہیں کیوں مجھے خوف سا محسوس ہوتا رہتا ہے کہ کہیں تو بھی..."

سفید دوپٹے کے ہالے میں ان کے چہرے اور آنکھوں میں شکوک ڈول رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔

اس کے ابا جی رزاق یونس نے تین جوان بیٹوں اور دو بیٹیوں کا خیال کیے بغیر ایک جوان لڑکی فرحت سے شادی کرلی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی اس سے ملاقات کہاں اور کیسے ہوئی تھی اور تعلقات ایکدم ہی شادی تک کیسے پہنچ گئے تھے مگر بہرحال وہ ان کی حویلی میں ان کی چھوٹی امی بن کر آچکی تھی۔ باپ کے رویے نے بیٹوں کو بھی شہ دی تھی۔ بیٹیاں تو دونوں بڑی اور شادی شدہ تھیں مگر بیٹے ابھی غیر شادی شدہ تھے۔ انیس بھیا نے سال بھر بعد ہی اپنی کلاس فیلو مہناز کے ساتھ شادی کرلی تھی اور عتیق بھائی نے بھی اپنی پسند بتادی تھی۔ وحیدہ ابا کے کزن کی بیٹی تھیں۔ یقیناً بے جی اس کی طرف سے بھی فکر مند تھیں۔

"نسرین کی فہمی کے لیے ارادہ ہے میرا۔ تو کہے تو بات بڑھاؤں آگے۔"

نسرین اس کی پھپھو تھیں نرم مزاج، محبت سے لبریز جذبات رکھنے والی، اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

☆ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔

☆ نئے بال اُگاتا ہے۔

☆ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔

☆ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔

☆ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

سوہنی ہیئر آئل قیمت =/70 روپے

12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہٰذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف =/70 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

1 بوتل کے لئے ---------- =/90 روپے

2 بوتلوں کے لئے ---------- =/160 روپے

3 بوتلوں کے لئے ---------- =/240 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان پتوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 2735021

ہمیشہ دوسروں کا خیال رکھنے والی اور فہمی بھی بالکل ان ہی کی طرح تھی۔ اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ خود بھی نرم مزاج تھا۔ دھیمے مزاج والی فہمی اس کے لیے بہترین شریک سفر ثابت ہوتی۔

"بے جی آپ جو چاہیں وہ کریں لیکن میری تعلیم۔"

ساری عمر بے جی نے ابا جی کی پسند ناپسند کے مطابق گزار دی تھی بڑھاپے میں سوتن کی نازبرداریاں کرنی پڑی تھیں۔ اب اگر کسی معاملے میں انہوں نے اپنی مرضی کا کہا تھا تو اسے ان کی ہر بات کو پورا کرنا تھا۔ وہ سب سے چھوٹا تھا بہت حساس تھا اور بے جی کے بہت قریب بھی۔

"اللہ تجھے خوش رکھے۔ تیرے ابا جی سے تو میں نے بات کرلی ہے اب نسرین رہ گئی میں کل ہی جاتی ہوں اس کی طرف، اسے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ میرے گھبرو پتر جیسا جوائی بھلا اسے کہاں ملے گا۔"

ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ ایسے خوش ہو رہی تھیں جیسے کل اس کی بارات لے کر جا رہی ہوں۔ وہ ان کے چہرے سے اس سچی خوشی کا عکس چھیننا نہ چاہتا تھا۔ فہمی اگرچہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن بے جی کا کہنا تھا کہ بیٹیاں ماں کا عکس ہوتی ہیں تعلیم سے زیادہ اسے پھپھو کی تربیت پر بھروسہ تھا اس کے پھپھا نذیر احمد غصیلی طبیعت کے ہر بات دوسروں پر مسلط کرنے والے انسان تھے اور ان کی کبھی ابا جی سے نہیں بنتی تھی۔ ابا جی کو اپنی زمین اور "میں" پر بڑا زعم تھا تو پھپھا کو اپنے آپ پر اور خود اپنی زمین پر زعم تھا لیکن اسے ان دونوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کے دل کے اندر محبت کا خانہ خالی تھا اور یہ یقیناً "فہمی کے لیے تھا۔

اس نے ساری تعلیم ہاسٹلز میں رہ کر حاصل کی تھی جہاں آزادی بھی تھی خود مختاری بھی اور پیسے کی چمک دمک بھی لیکن اس سب کے باوجود وہ کسی برائی میں مبتلا نہیں ہوا تھا بے جی کی سادگی، مذہب اور تربیت کا اثر اس قدر اس کی شخصیت پر گہرا تھا کہ اس کے گرد منڈلانے والی رنگین تتلیاں خود ہی اس کا راستہ چھوڑنے پر مجبور ہو جاتیں۔ تعلیم اس کا شوق تھا ورنہ اس جیسے شخص کو روزگار کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

بے جی کب کی اٹھ کر اندر جا چکی تھیں۔ وہ کتنی دیر فہمی کے بارے میں سوچتا رہا۔

"اگر بے جی ایسے ہی خوش ہیں تو یہی سہی۔ شادی کی تیاری کرتے بھی کچھ عرصہ تو لگے گا۔"

اس نے خود کو مطمئن کرلیا۔

* * *

"امی حشمت چاچا کو ایسی کون سی خوبی مجھ میں نظر آگئی ہے کہ میری جگہ کوئی اور اس جگہ جا ہی نہیں سکتا۔ اچھا بھلا دل لگ گیا تھا یہاں۔ ہاسپٹل بھی قریب تھا۔"

کمرے کا بیسواں چکر لگاتے اس نے فہمیدہ خاتون کو دیکھا جو اسے دیکھنے کے ساتھ سبزی بنانے میں مشغول تھیں۔

"اگر حشمت چاچا کے علاوہ کسی اور نے کہا ہوتا تو..."

اس نے زور سے مکا اپنی ہتھیلی پر دے مارا۔ انہوں نے اس کی بے چینی اور برا موڈ دیکھا اور بھنڈیاں کاٹ کاٹ کر ٹوکری میں رکھنے لگیں۔

"انہیں معلوم ہے کہ میں ان کو انکار نہیں کرسکتی۔"

اب اس کے انداز میں بے چینی کے ساتھ بے بسی بھی شامل ہوگئی تھی اس کی ہلکی براؤن آنکھیں کمرے میں بیٹھی مزنہ پر جمی تھیں۔ اس کے گول چہرے پر بلا کی معصومیت کے ساتھ سوچ کے سائے لہرا رہے تھے۔

"وہ جاہل شخص کہہ رہا تھا فیملی والے لوگ وہاں زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتے۔"

اس کی آواز اچانک تیز ہوئی اور بتدریج آہستہ ہوتی چلی گئی۔

"کیا میری فیملی نہیں ہے۔ کیا مجھے فیملی کی اور فیملی کو میری ضرورت نہیں ہے۔" فیملی کا خیال آتے ہی

نہ جانے کیوں ایک گھونسا دل پہ پڑا تھا۔

یکدم ہی اس نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا تھا۔

"سلوئی! اگر حشمت بھائی تمہیں بھیج رہے ہیں تو کچھ سوچ کر ہی بھیج رہے ہوں گے۔ کیوں اپنی اور ہماری جان تنگ کر رہی ہو۔ اگر اس نے ساتھ جانے کا کہا ہے۔ تو اسی پر الٹ پڑی ہو اور اکیلے جانے کی بات ہو رہی تھی تو تب بھی...."

فہمیدہ ٹھنڈے مزاج کی خاتون تھیں مگر سلوئی اور مزنہ کے بابا کے بعد وہ ہر بات میں حشمت عثمانی کی طرف دیکھتی تھیں۔ ملک توفیق کئی سال پہلے انتقال کر چکے تھے اس کے بعد سے وہ بالکل تنہا ہو کر رہ گئی تھیں۔

"امی تایا ابا سے بابا کی لڑائی ہوئی تھی؟"

سلوئی نے اچانک فہمیدہ کو مخاطب کیا۔ انہوں نے قریبی رشتوں میں صرف تایا کو دیکھا تھا وہ بھی کبھی کبھار آتے تھے حقیقتاً" وہ ان دونوں سے بہت پیار کرتے تھے لیکن یہ عزیز از جان تایا نہ جانے بابا کی وفات پر انہیں کیوں اکیلا چھوڑ گئے تھے انہوں نے آنا تو ایک طرف کبھی اطلاع تک دینا گوارا نہیں کیا تھا۔

"نہیں"۔ خشک لہجے میں جواب دے کر وہ پھر اپنے کام کی جانب متوجہ ہو چکی تھیں تایا کا ذکر کرنے پر وہ ایسے ہی خاموش ہو جایا کرتی تھیں۔

سلوئی کی یادوں میں عادل کا چہرہ بھی محفوظ تھا جو اس کا تایا زاد تھا لیکن وہ اتنی بار ان کے گھر نہیں آیا تھا۔

اس کے حافظے میں وہ خوبصورت شام نقش ہو کر رہ گئی تھی اس نے بابا کو بے تحاشا خوش دیکھا تھا۔ تایا اور عادل بھی وہیں موجود تھے۔ تایا بار بار اسے چومتے تھے اور اسے اپنے گھر کی روشنی کہہ رہے تھے اس نے کئی بار امی بابا سے اس تقریب کے بارے میں پوچھا تھا مگر وہ دونوں ہی خاموش ہو جاتے تھے کوئی بھی جواب دینے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ ہاں بڑے ہونے پر اس نے کئی بار تایا ابا کو آتے دیکھا تھا مگر عادل ایک دو بار ہی آیا تھا بابا کو اس نے ہمیشہ تایا کا انتظار کرتے دیکھا تھا۔ آخری وقت میں بھی ان کی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں مگر وہ نہیں آئے تھے۔ انہوں نے حشمت انکل سے کچھ کہا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں حشمت چاچا واحد شخص تھے جنہوں نے بابا کے بعد مکمل طور پر ان کے خاندان کو سہارا دیا تھا۔ حشمت چاچا بابا کے دوست تھے مگر انہوں نے سگے رشتہ داروں سے بڑھ کر ساتھ دیا تھا۔

"حشمت وہ واحد شخص ہے جس کے خلوص پر مجھے کوئی شبہ نہیں۔ اگر میں چاہوں بھی تو اس کی محبت اور خلوص کا قرض نہیں اتار سکتا۔"

بابا کے بہت پہلے کے کہے گئے جملے اسے آج بھی انہی لفظوں کے ساتھ یاد تھے۔ بابا کے کہے جملوں نے یکدم ہی اس کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ اس کا غصہ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ فہمیدہ اور اس کے بابا دونوں بہت تحمل اور صبر والے تھے نہ جانے وہ کس پر گئی تھی۔ کبھی کبھار اسے شدید تنہائی کا احساس ہوتا اس کا کوئی رشتے دار نہیں تھا نانا، نانی، دادا، دادی، چچا، خالہ سب ہی رشتے اس کے لیے اجنبی تھے اس کے بابا دو بھائی اور امی اکلوتی تھیں اگر حشمت چاچا، سلیمہ آنٹی، ارم اور ارجمند نہ ہوتیں تو یہ تنہائی کئی گنا زیادہ ہوتی مگر حشمت چاچا کی بیٹیوں اور بیوی نے بالکل اپنوں کی طرح انہیں رشتوں کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا تھا۔ شاید وہ دنیا کا واحد گھرانہ تھا جن کا کوئی قریب دور کا رشتہ دار نہیں تھا وہ خوش مزاج تھی، زندہ دل تھی بہت باتیں کرنے والی ـــــ مگر ان سب کے ساتھ وہ بہت حساس بھی تھی اور جب کبھی حساسیت کا دورہ پڑتا وہ گھنٹوں سوچا کرتی۔ اس کے بابا اور امی نے ایک مثالی زندگی گزاری تھی اس نے کبھی انہیں ایک دوسرے سے اونچا بولتے بھی نہیں سنا تھا کجا کہ لڑائی مگر مثالی والدین مثالی تربیت کے باوجود نہ جانے کیوں ایک تشنگی اس کے اندر بچپن سے ہی موجود تھی۔

☼ ☼ ☼

"آخر پینڈو کو لاہور کی بتیاں کھینچ ہی لائیں۔"

گرمجوشی سے اس کے گلے لگتے معیز نے ہمیشہ کی

طرح اس پر پھبتی کسی اور اسے ہر بار کی طرح غصے کی بجائے ہنسی آگئی تھی اپنے کندھے تک آتے معیز کو زور سے دبا کر چھوڑ دیا۔

"پینڈو کو لاہور کی بتیاں تو نہیں البتہ چڑیا گھر کے دو جانور ضرور کھچ مار رہے تھے۔"

اسی کے انداز میں جواب دے کر وہ حماد کی جانب بڑھا جو دونوں کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ معیز کو فون کر کے اسی نے حماد کے آفس آنے کو کہا تھا۔ شہر کا چکر دو مہینے بعد لگا تھا اور آج ان سے ملنے کا پکا ارادہ کر کے آیا تھا۔

"یار اس ڈنگر...... ڈاکٹر کی طرف دیکھو۔"

معیز نے ڈنگر اور ڈاکٹر کے درمیان محسوس کیا جانے والا وقفہ رکھا تھا اس کے انداز پر تیمور اور حماد کا قہقہہ بے اختیار بلند ہوا۔ حماد نے اپنے چھدرے بالوں والے سر پر ہاتھ پھیرا معیز کے ہاتھوں بننے والی متوقع درگت اسے شامتِ اعمال کی طرح لگ رہی تھی۔

"ڈنگر ڈاکٹر بن کر اس کے بال اڑ گئے ہیں اگر کہیں انسانوں کا ڈاکٹر بن جاتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔"

اس نے حماد کے کم ہوتے بالوں پر چوٹ کی تھی۔

اس کے انداز پر تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ حماد ویٹ ڈاکٹر تھا۔ پاکستان سے ڈگری لینے کے بعد اس نے مرغیوں پر پی ایچ ڈی کی تھی۔ اور جدید خطوط اور مشینری پر استوار پولٹری شیڈ پاکستان میں متعارف کروا رہا تھا۔ مرغیوں کی ساری فیڈ وہ امپورٹ کر رہا تھا اور کئی شہروں کو سپلائی بھی کر رہا تھا۔ اس کا باپ انڈسٹریلسٹ تھا مگر اس نے اپنے باپ کے ساتھ کام کرنے کی بجائے ایک نئے شعبے کو چنا تھا اور اس نئے شعبے میں بھی بہت جلد اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔ وہ تینوں اسکول کے زمانے کے دوست تھے۔ بظاہر ان کے مشاغل، تعلیم، مضامین اور حالات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے مگر ان کی دوستی پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"اور سناؤ کیا حال ہے تمہارے شوق کا۔"

چمڑے کے کالے صوفے پر بیٹھتے اس نے حماد سے پوچھا جس کا شاندار آفس اس کے شوق کی روز افزوں ترقی کا حال سنا رہا تھا۔

"اے ون، چار بڑے شہروں سے ڈیمانڈز آچکی ہیں کچھ اور شہر بھی فہرست میں شامل ہیں اس سال کے آخر تک امید ہے کہ کاروبار کئی شہروں میں پھیل جائے گا۔"

فون پر ملازم کو کچھ لانے کا کہہ کر اس نے موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے جھانکا۔

"اور تم سناؤ گاؤں میں سب ٹھیک ہیں۔"

"ہاں سب ٹھیک ہیں۔ رفیع بھائی پنڈی میں فیکٹری لگانے کی تیاریوں میں ہیں بابا بھی پچھلے دنوں ان کے ساتھ تھے میں ہسپتال کے سلسلے میں مصروف تھا اور زمینوں کی دیکھ بھال بھی ساری مجھ پر آن پڑی ہے ضیاء اپنا اسٹوڈیو کھول رہا ہے بابا اس سے ناراض ہیں آج کل نہ جانے کن چکروں میں پڑا ہے۔"

سگریٹ سلگا کر اس نے حماد اور معیز کی جانب دیکھا جو اسے غور سے سن رہے تھے۔ چپڑاسی جوس کے گلاس رکھ کر جا چکا تھا۔

"آپی خوش ہیں نا معیز اپنے گھر۔"

معیز کی بڑی بہن کی شادی دو مہینے پہلے ہی ہوئی تھی وہ پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اس کے والد لانڈری کا کام کرتے تھے اب ساری ذمہ داری اسی پر تھی، معیز ایم اے اکنامکس تھا جس لیدر فیکٹری میں وہ کام کرتا تھا وہ دیوالیہ ہو کر بند ہو چکی تھی آج کل وہ نوکری کی تلاش میں تھا۔

"ہاں۔"

مختصر جواب دے کر اس نے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو ایک بار پھر ٹیبل پر رکھ دیا۔ گلاس اسی طرح بھرا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے والا چلبلا معیز نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔ روشن قندیلوں جیسی چمکتی آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے ایک دم ہی سنجیدگی اتر آئی تھی۔ تیمور اور حماد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اس کے سنجیدہ انداز پر اسے دیکھنے لگے۔ حماد اس کی سنجیدگی کی وجوہات جانتا تھا۔

"ساہیوال میں فیڈ کی مارکیٹ کے لیے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اگر تمہاری ذہانت میرے کام نہیں آئی تو تف ہے ایسی ذہانت پر جو دوست کے کام نہ آسکے۔"

حماد نے جذباتی انداز اختیار کر کے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ پہلے بھی ایک دو بار اسے اپنے ساتھ کام کرنے کو کہہ چکا تھا مگر تب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ پہلے وہ فیکٹری میں مصروف تھا۔ معیز کتنی دیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"آموں کی فصل اس بار اتنی اچھی ہوئی، انتظار ہی رہا کہ تم لوگ چکر لگاؤ گے، مینگو پارٹی ہو گی۔ نہر کے کنارے درختوں کی جھکی شاخیں......"

اس تپتی دوپہر میں اسے نہر کا ٹھنڈا ٹھار پانی بے طرح یاد آیا۔

"آج تو جناب کی منظر نگاری عروج پر ہے۔ موڈ بھی خوش گوار ہے، ورنہ اس آکسفورڈ سے پڑھے زمین دار کو غصے میں دیکھ لو۔ ایسا لگتا ہے تعلیم "چھو" کر بھی نہیں گزری۔ ایسے نازک احساسات واللہ۔"

حماد نے "چھو" کے لیے خاص ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کی بات پر معیز اور تیمور نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ وہ تینوں مہینوں بعد اکٹھے ہوئے تھے اور جہاں وہ اکٹھے ہوتے، ایک دوسرے پر جی بھر کے تنقید کرتے۔ اس کا شعلہ و شبنم رویہ، غصیلا موڈ، وہ دونوں اس کی ہر ادا سے واقف تھے۔ حماد اور تیمور نے انگلینڈ میں بھی کچھ وقت ساتھ گزارا تھا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے، اس ویک اینڈ پر میں تم دونوں کا انتظار کروں گا۔"

سگریٹ کا آخری کش لے کر اس نے اسے ایش ٹرے میں پھینک دیا۔ سگریٹ کی عادت مستقل تو نہیں تھی مگر کبھی کبھار کا شوق ضرور تھا کیونکہ آج کوئی منع کرنے والا موجود نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر بھر میں ایک رونق سی تھی۔ نسرین پھپھو نے ہاں کر دی تھی اور بے جی نے انگوٹھی پہناتے ہی شادی کی تاریخ بھی رکھ دی تھی۔ دور و نزدیک کی رشتہ دار خواتین سارا سارا دن ان کے صحن میں دائرہ بنائے جانے کیا باتیں کیا کرتیں۔ اس نے تو سب کچھ بے جی کے سپرد کر دیا تھا مگر ہمیشہ کی طرح اب کے بار بھی خوشیوں کے موقع پر ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور شادی کی تیاریاں اس مسئلے تلے دب گئی تھیں۔ ابا جی نے فرحت۔ کو طلاق دے دی تھی۔

"میں نے کسی سے پوچھ کر شادی کی تھی نہ ہی میں کسی کو بتانے کا مجاز ہوں۔"

اندر سے آتی آواز پر اس کے قدم وہیں جم گئے۔ اگرچہ فرحت کے ساتھ نہ انہیں انسیت تھی نہ ہی کوئی تعلق مگر اس کے باوجود بے جی اس کی حمایت کر رہی تھیں۔ آخر وہ چار سال اس حویلی میں رہی تھی۔

"اس کا قصور کیا ہے۔"

"کیوں، تم منصف لگی ہو کہ تمہیں صفائی دی جائے۔ اپنے کام سے کام رکھو۔"

اس کے باپ کا رویہ ہمیشہ ماں کے ساتھ ایک حاکم کا سا رہا تھا۔ اس عمر میں جب دونوں کو ایک دوسرے کی زیادہ ضرورت تھی، ابا جی کو ابھی بھی ان بات کی سمجھ نہ آسکی تھی۔

رزاق یونس نے نہ تو اس سے شادی کرتے وقت کسی سے صلاح لی تھی اور نہ ہی طلاق دیتے وقت کسی کو کچھ بتایا تھا۔

"اپنی عقل اپنے پاس رکھو، سنا تم نے۔"

بے جی نے ہلکی آواز میں کچھ کہا تھا جس کے جواب میں رزاق یونس ایک دم ہی بھڑک اٹھے تھے۔ اس نے ست روی سے اپنے قدموں کا رخ اپنے کمرے کی جانب موڑ لیا۔ اچھا ہی تھا کہ وہ یہاں نہیں رہتا تھا۔ کچھ وقت گزارنا ہی مشکل ترین ہو جاتا تھا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ آنے والے خوبصورت دنوں کی بجائے اس کے ذہن میں ابا جی کا کڑکتا لہجہ اور بے جی کا گڑگڑاتا انداز گردش کر رہا تھا لیکن عملی زندگی کا آغاز کرنے سے

پیشتر ہی وہ یہ فیصلہ ضرور کرچکا تھا کہ اسے روایتی چوہدریوں کی طرح زندگی نہیں گزارنی۔ اسے نئی آنے والی عورت کو بھی اتنی ہی عزت اور تکریم دینی تھی، جتنی وہ اپنی کرتا تھا اور یہ فیصلہ کرکے وہ بہت مطمئن بھی تھا مگر تقدیر اسے آزمانے کے لیے تیار تھی۔ بیڈ سائیڈ پر عینک اتار کر رکھی۔ عینک مستقل طور پر لگنے سے ناک کے اوپری حصے میں بنے داغ کو سہلایا اور تکیے پر سر رکھ کر خود کو ریلیکس کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"پچھلے سال ڈاکٹر سرفراز یہاں تھے۔ کام بھی اچھا کررہے تھے مگر انہیں اپنے دونوں بیٹوں کے مستقبل کی بہت فکر تھی، اسی لیے وہ یہاں رک نہیں سکے۔ حالانکہ ہم نے پوری کوشش کی کہ وہ یہاں رہیں۔ گاڑی اور ڈرائیور کا انتظام کیا مگر....."

ڈاکٹر حشمت کے ساتھ چلتا تیمور انہیں اسپتال کے کمرے بھی دکھا رہا تھا اور ساتھ ہی انہیں بتا بھی رہا تھا۔ ڈاکٹر حشمت، ارم اور مزنہ اسے چھوڑنے آئے تھے۔ وہ تینوں پیچھے پیچھے تھیں۔

"نرس سکینہ پہلے بھی ان کے ساتھ تھی، اب آپ کی بھی مدد کرے گی۔"

ڈاکٹر حشمت کے ساتھ چلتے اچانک اس نے پیچھے مڑ کے اسے دیکھا جو دیوار پر لگے کیلنڈر کو دیکھ رہی تھی۔ ارم نے اسے کہنی مار کر متوجہ کیا۔ اس کے متوجہ ہونے سے پہلے ہی وہ ڈاکٹر حشمت کے ساتھ پھر مگن ہوچکا تھا۔

"رہائش کے لیے یہاں بھی دو تین کمرے موجود ہیں مگر یہ جگہ آبادی سے تھوڑی دور ہے، اس لیے ان کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔"

ڈاکٹر حشمت کو بتاتے اس نے ایک بار پھر سلوی کی جانب دیکھا جو ارم کے ساتھ باتوں میں محو تھی۔

"کھانا کھائے بغیر تو جانے نہیں دوں گا آپ کو۔"

ان کے جانے کے ذکر پر اس نے بہت اصرار سے انہیں کھانے کی دعوت دی تھی مگر ڈاکٹر حشمت نے اندھیرا ہونے کے باعث معذرت کرلی تھی۔

رنگین پایوں والا پلنگ، اسی طرح کی دو بڑی کرسیاں، ایک طرف بڑی منقش الماری، کمرے کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے اس نے کندھے سے بیگ اتار کر پلنگ پر رکھ دیا۔ حشمت چاچا، ارم اور مزنہ اسے گھر چھوڑ کر جاچکے تھے۔ گاؤں کے گھروں کی طرح تین کمرے ان کے آگے برآمدہ، کھلا صحن۔ اگرچہ اس نے پہلے نہ گاؤں دیکھا تھا، نہ گاؤں کے گھر لیکن بہت بار پڑھ ضرور چکی تھی۔ برآمدے میں کھڑے ہوکر اس نے گہرے ہوتے اندھیرے پر نظریں جمادیں۔

"سلام بی بی جی۔"

پینتیس چھتیس سالہ عورت آٹھ نو سال کے بچے کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے سر ہلا کر سلام کا جواب دیا۔

"میرا نام صابرہ ہے، یہ میرا بیٹا شاہد۔ مجھے چھوٹے ملک جی نے بھیجا ہے۔ اب میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔"

اسے اپنے بارے میں بتا کر وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے اب بھی سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"وہ جی اپنا سامان کدھر رکھوں۔"

اسے کتنی دیر خاموش دیکھ کر اس نے اپنا مدعا جھجکتے جھجکتے بیان کیا۔

"جہاں تمہارا دل چاہے رکھ لو۔"

اسے جواب دے کر وہ اندر کمرے میں چلی آئی۔ دنیا جہان کی بے زاری اس پر چھائی ہوئی تھی۔ حشمت چاچا اور مزنہ لوگوں کے جانے کے بعد ایکدم ہی اس پر اداسی کا دورہ پڑا تھا۔ وہ کبھی گھر سے دور نہیں رہی تھی۔ شاید یہ کیفیت اسی بدولت تھی لیکن اسے یقین تھا کہ یہ زیادہ دیر تک نہیں رہے گی۔

"بی بی چائے لاؤں آپ کے لیے۔"

صابرہ نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا۔ اسے اپنے تھوڑی دیر پہلے کے رویے پر شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔ اب کے لہجہ پہلے سے اچھا تھا۔

"نہیں، چائے تو نہیں، البتہ کھانا۔"

روانی میں وہ کہہ تو گئی تھی مگر اچانک ہی اسے خیال آیا کہ ابھی اسے ہر چیز کے لیے خریداری کرنی ہے۔

"وہ ملکانی جی نے کھانا بھیجا ہے آپ کے لیے، وہ تو چاہ رہی تھیں کہ خود آپ کے پاس آئیں لیکن شام ڈونگی ہوگئی تھی اور ان کا جوڑوں کا درد..... اس لیے وہ نہیں آسکیں۔ چھوٹی بی بی بھی آگئی ہیں، صبح وہ ضرور آپ سے ملنے آئیں گی۔"

صابرہ نے اسے تفصیلی ہر چیز سے آگاہ کیا، وہ سر ہلاتے اسے سنتی رہی۔

"پھر کھانا لے آؤں آپ کے لیے۔"

صابرہ نے ایک بار پھر پوچھا۔

"ہاں، لے آؤ۔"

"اچھا جی۔"

"صابرہ اپنے بیٹے کو بھی بلالو اور تم بھی آجاؤ۔"

ہاتھ دھو کر اس نے کھانا شروع کردیا۔

رات کے آٹھ بجے ہی ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں قریب و دور سے سنائی دے رہی تھیں۔ تمام جدید سہولتوں سے مزین گاؤں کے اس کمرے میں اسے امی، بابا اور مزنہ بے طرح یاد آرہے تھے۔ سوچوں میں گھرے نہ جانے آنکھ کب لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں تو سمجھی تھی موٹے شیشوں کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں اور جوڑے میں بندھے بالوں والی کرخت سی شکل والی کسی ڈاکٹر سے ملنے جارہی ہوں، پر یہاں تو نقشہ ہی الگ ہے۔"

فائقہ ذہن میں آئی کسی سوچ کو بھی اندر رکھنے کی قائل نہیں تھی۔ وہ کل شام گاؤں پہنچی تھی، کل تو اس سے ملنے نہیں آسکی تھی مگر آج وہ اس کے گھر موجود تھی۔ سبک ناک نقشے والی سلوی کو ڈاکٹر کے روپ میں دیکھ کر اس کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئی تھیں۔ حیرت و اشتیاق سے وہ اس کے من موہنے چہرے اور معصومیت سے بھرپور انداز کو تکے جارہی تھی۔ سلوی نے جھینپ کر چہرہ جھکالیا۔ فائقہ بہت جلد بے تکلف ہوجانے والی ہستی تھی اور خود سلوی بھی تکلف وغیرہ کی قائل نہیں تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ پرانے دوستوں کی طرح محو گفتگو تھیں۔

"ابھی ہاؤس جاب مکمل ہی ہوا تھا کہ حشمت چاچا نے یہاں بھیج دیا۔"

فائقہ کے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا۔

"امی اور مزنہ وہیں ہیں۔ حشمت چاچا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"کل کا تمہارا کھانا حویلی میں ہے۔ بے جی نے خاص طور پر تمہیں بلوایا ہے۔ وہ تو خود تم سے ملنا چاہتی تھیں مگر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی، زیادہ چل پھر نہیں سکتیں۔"

فائقہ نے پاؤں جھلاتے ہوئے اسے بے جی کا پیغام پہنچایا۔ "میں ویسے ہی بے جی سے ملنے آجاؤں گی۔ کھانے کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیسا تکلف۔ بس تم آرہی ہو کل کھانے پر۔ میں انتظار کروں گی۔"

اس کی بات کاٹ کر وہ اللہ حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔

سفید کلف لگا کاٹن کا جدید تراش کا خوبصورت سوٹ پہنے اس نے دوپٹا اٹھا کر شانوں پر پھیلایا۔ چہرہ کسی بھی قسم کی آرائش سے مبرا تھا۔ بالوں کو کیچر میں جکڑ کر سمیٹ دیا تھا۔ شاہد کو ساتھ لے کر وہ حویلی آگئی۔

؎ وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی وہ اندر سے باہر آتے ہوئے لڑکے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ اس کی نگاہیں اس وقت سے اسی کو فوکس کیے ہوئے تھیں۔ عجب انداز میں وہ خود کلامی کے انداز میں کبھی اسے دیکھ کے شعر پڑھنے لگتا، کبھی کچھ بڑبڑانے لگتا۔

"شاید آپ راستہ بھٹک کر ادھر آنکلی ہیں۔"

شدید نروس ہوتے کوفت بھرے انداز میں وہ اس

فضول شخص سے پیچھا چھڑانے کی ترکیب سوچ رہی تھی جو اس کے دو بار پکارنے پر بھی ہوش میں آنے کو تیار نہیں تھا۔ اسی دم فائقہ کی آواز پر اس نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

"شکر ہے تم آئیں تو۔ اتنی دیر، مابدولت اتنی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ ہیں کہ......"

تیز تیز بولتے اس نے اسے ساتھ لگا لیا۔

"ضیاء! یہ ڈاکٹر سلویٰ ہیں۔"

فائقہ نے اسے ایک طرف کھڑے دیکھ کر اس کا تعارف کروایا۔

"میں اور ضیاء جڑواں ہیں۔"

اس کی اطلاع پر اسے حیرت ہوئی تھی، اتنی سلجھی ہوئی لڑکی اور اس کا دوسرا اجڈ بھائی اور پھر یہ بھی۔

"سارے خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک عجوبہ شخصیت موجود ہے۔" دل میں سوچتے اس نے فائقہ کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔

"اگر گلی میں کہیں بیٹھ جائے تو لوگ بھیک منگا سمجھ کر خیرات دے جائیں گے۔ پڑھ کر اس نے بڑے چن چڑھائے ہیں۔ کچھ کمی رہ گئی ہے تو اسے اسٹوڈیو کھول کر پوری کر دیتا ہوں۔"

فائقہ کے ساتھ اس کے کمرے میں بیٹھے وہ بے جی کا انتظار کر رہی تھی جب اونچی آواز پر وہ دہل کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بابا تو کبھی اونچی آواز میں بولتے تک نہیں تھے اور یہ دھاڑتی آواز وہ گھبرا کر کھڑی فائقہ کی طرف دیکھنے لگی۔

"بڑے ابا ڈانٹ رہے ہیں ضیاء کو۔ تم بیٹھ جاؤ، یہ تو روز کا معمول ہے۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے پھر بٹھا لیا۔

"بابا اور امی کی وفات کار ایکسیڈنٹ میں ہوئی۔ بڑے ابا یعنی دادا بہت سخت ہیں لیکن پاپا کے جانے کے بعد ان کے بے جا لاڈ پیار نے ضیاء کو بگاڑ دیا ہے۔"

فائقہ کے امی بابا کا سن کر اسے افسوس ہوا تھا، اتنی ہنستی مسکراتی زندہ دل لڑکی اور اتنا بڑا دکھ۔

"آؤ تمہیں بے جی کے پاس لے چلتی ہوں، وہ تسبیح کر رہی ہوں گی۔"

فائقہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے آئی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں چمکتا خوبصورت چہرہ اور نرم انداز اسے بالکل بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تو کئی بار تیمور سے کہا تھا کہ اسے حویلی میں ہی لے آؤ، اس کا اپنا گھر ہے۔ گھر سے دور بے چاری بچی اداس ہو گی لیکن وہ نہیں مانا۔ پر پتر! تو اسے اپنا ہی گھر سمجھنا۔ فائقہ بھی آتی رہتی ہے، پر میں تو ادھر ہی ہوتی ہوں، اس کی دادی ہوں تو تیری بھی، مجھ سے ملنے ہی آ جایا کر۔"

اتنے میٹھے لہجے میں بات کی تھی انہوں نے کہ وہ ان کی طرف دیکھتی رہی۔

"ہے تو تو نکی سی پر تیمور بڑی تعریف کر رہا تھا تیری، رب نے شکل کے ساتھ ساتھ دل بھی چنگا دیا ہے، جو ادھر غریبوں کے واسطے سب کچھ چھوڑ کر آ گئی ہے۔"

اسے خود پر شرمندگی ہوئی، کیسے روتے دھوتے وہ یہاں تک آئی تھی۔

"کتنے بہن بھائی ہو تم لوگ، ابا جی کیا کرتے ہیں۔"

"بس ہم دو بہنیں ہیں بابا کی تو کئی سال پہلے وفات ہو چکی ہے۔"

"باقی رشتہ دار۔"

انہیں نہ جانے کیا کھوج تھی۔ کتنی دیر وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔

"امی اکلوتی ہیں بابا کے ایک اور بھائی ہیں۔ بس ہمارا خاندان بہت چھوٹا سا ہے۔"

سر ہلا کر وہ تسبیح گھمانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"اس بے غیرت شخص کو بہت مہنگا پڑے گا یہ فیصلہ۔ کیا سمجھتا ہے کہ میں چپ کر کے بیٹھ جاؤں گا اور جو وہ کرتا رہے گا، وہ دیکھتا رہوں گا، سنتا رہوں گا۔"

رزاق یونس چوہدری غضب ناک لہجے میں دھاڑ رہے تھے۔ کمرے میں موجود افراد کو جیسے سانپ سونگھ

گیا تھا۔ شادی والے گھر میں بجنے والی ڈھولک کب کی خاموش ہو چکی تھی۔ ہر طرف موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ دن پہلے تک فرحت بی بی کا تذکرہ ہو تا رہا تھا۔ اب جبکہ اس طرف سے دھیان ہٹا تھا' پھپھا نذیر احمد نے فرحت کے ساتھ نکاح کر کے ایک بار پھر باتوں' سرگوشیوں اور غضب کو آواز دے ڈالی تھی۔

پرسوں اس کی بارات نسرین پھپھو کے گھر جانے والی تھی۔ ابھی رات ہی تو اس کا نکاح فہمی سے ہوا تھا اور صبح کیسی نحوست اور کالی سیاہی ہر طرف پھیر گئی تھی۔ سب جیسے سکتے کی کیفیت میں تھے۔ یقین کسی کو بھی نہیں آرہا تھا مگر یہی سچ تھا۔

"اس بے غیرت کی حرکتوں کی وجہ سے میں نے اسے چھوڑ دیا۔" انہوں نے دھماکا کیا تھا۔

"اگر اتنے عرصے میں چپ تھا تو اپنی بہن کی وجہ سے۔"

ہاتھ پر مکا مارتے انہوں نے اپنے لب بھینچ لیے۔

"کئی بار اس کے ساتھ اس کو دیکھا۔ میرے ہی گھر میری عزت سے کھیلتا رہا لیکن اب میں چپ نہیں رہ سکتا۔"

ہر شخص اپنی جگہ تشویش کا شکار تھا۔

"ابھی اسی وقت اس کی بیٹی کو طلاق دے دو' اسے بھی تو پتا چلے کہ دوسروں کے ساتھ کھیل کھیلنے والوں کے ساتھ خود بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

کمرے کا طول و عرض ناپتے وہ اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ان کے چہرے پر بے چینی کے ساتھ فیصلہ کر لینے کی طمانیت بھی جھلک رہی تھی۔ شفاف عینک کے پیچھے سے دیکھتے وہ شاید کچھ بھی سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ بس سر اٹھائے انہیں دیکھتا رہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔"

سب سے پہلے ہوش میں آکر ان کے سامنے جانے اور سوال کرنے والی بے جی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"فارسی نہیں بول رہا میں۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں' سب کی سمجھ میں آرہا ہے۔"

لفظ چبا چبا کر ادا کرتے انہوں نے کمرے میں بیٹھے اپنے بیٹوں اور بہوؤں پر نظر ڈالی سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ فرحت کے معاملے کو سامنے آئے کچھ دن ہو گئے تھے اور سب کے دل طرح طرح کے خدشات سے لرزتے رہے تھے مگر اس طرح کا خدشہ کسی کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"لیکن اس میں پھپھو کا کیا قصور ہے۔ انہیں کس بات کی سزا دے رہے ہیں آپ۔ اس جیسے باپ کے لیے بیٹی کی بربادی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہاں پھپھو ضرور ڈھے جائیں گی۔ ساری زندگی وہ کون سا سکھ کا سانس لے سکی ہیں۔"

عتیق چوہدری نے پھپھو کی طرف داری کرتے جھجکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

"اس کا قصور یہ ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں آئی' میں نے اسے کہا تھا کہ اسے چھوڑ کر میرے پاس آجائے لیکن چھوڑنا تو درکنار وہ تو اسے برا تک نہیں کہتی۔"

ان کے لہجے میں بہن کے لیے بھی نفرت جھلک رہی تھی۔

"بس تم اسی وقت طلاق لکھو۔"

کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھتے انہوں نے توفیق چوہدری پر نظر ڈالی جو کمرے میں موجود ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ بھرے کمرے میں موجود افراد ایک دوسرے کے فق چہرے دیکھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

کھلے میدان میں بغیر کسی سائے کے سورج کی تیز تپش براہ راست اسے جھلسا رہی تھی۔ سفید ٹی شرٹ پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے کچھ لوگ دور درخت تلے سستا رہے تھے مگر اس پر اس وقت ایک ہی دھن سوار تھی' اپنے سامنے بڑے بڑے کاغذ' پنسل اور اسکیل رکھے وہ نقشہ بنانے میں بری طرح محو تھا۔ سر پر پہنی ٹوپی سورج کی براہ راست تپش سے سر اور آنکھوں کو بچا رہی تھی۔

زمان اور مقتدر فیتا لیے ناپنے میں مشغول تھے۔

"تیمور بھائی! جب یہاں چاولوں کی چھڑائی اور صاف کر کے پیک کرنے والی مشین لگ جائے گی تو کتنا اچھا ہو گا۔ بہت سے لوگوں کو روزگار کے لیے شہر نہیں جانا پڑے گا۔ چاولوں کو برآمد کرنے میں بھی آسانی ہو گی۔ ہمارے چاول تو پہلے بھی بہترین ہوتے ہیں' یہ الگ بات کہ کسی نے توجہ نہیں دی۔"

مقتدر اس کے ساتھ آن کھڑا ہوا۔ ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص میں اس کا گندمی رنگ دھوپ سے سرخ ہو کر اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ تیمور نے پنسل ہاتھ سے میز پر رکھ کر ہاتھوں میں آیا پسینہ شرٹ کے ساتھ صاف کیا اور پنسل پکڑ کر میدان پر نگاہیں دوڑانے لگا۔

"ہاں یار! آسانی تو بہت ہو جائے گی۔ پہلے تو اس کا نقشہ تیار کرنا پڑے گا۔ پلانٹ' مشینیں تو بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو کافی عرصہ لگے گا۔ تعمیر' تزئین اور پھر باقی کام۔"

مصروف انداز میں اسے تفصیلی جواب دے کر اس نے اسکیل رکھ کر لکیر کھینچی۔ اس نے آرکیٹکچر میں ڈگری لی تھی۔ یہاں آکر ارادہ کسی فرم کو جوائن کرنے کا تھا اور پھر اپنی فرم کھولنے کا مگر یہاں آکر مصروفیت نے اسے کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیا تھا۔ رفیع بھائی اور بابا شاید اس کے آنے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ اس کے آتے ہی رفیع بھائی نے نئی فیکٹری پر توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ ضیاء کا شعبہ بالکل ہی الگ تھا۔ نتیجتاً" زمینوں کی ساری دیکھ بھال اسی پر آن پڑی تھی۔ بیریوں والی زمین جو کاشت کے قابل نہیں تھی' اس کے گڑھے بھروا کر اس نے اس کا مصرف تلاش کرنا شروع کر دیا تھا اور آخر تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ اپنی تعلیم کو کام میں لا کر وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ فیکٹری اور جدید پلانٹ کی تنصیب کے لیے اس نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ اگرچہ ابھی پروجیکٹ ابتدائی مراحل میں تھا مگر اس نے کام شروع ضرور کر دیا تھا۔

زمان اور مقتدر اور دوسرے کئی لوگ جوش و خروش سے اس کام میں حصہ لے رہے تھے' اس لیے اسے دوہری ذمہ داریوں کے لیے بھی ساتھی مل گئے تھے۔ اگرچہ وہ غصے کا تیز تھا مگر اس کا اپنے "کاموں" کے ساتھ رویہ اتنا اچھا ہوتا کہ اس کا کبھی کبھار کا غصہ وہ ہنس کر سہہ لیتے۔ تین دن سے وہ مسلسل یہیں تھا۔ کبھی پروجیکٹ پر کام کرنے لگتا تو کبھی زمینوں کے معاملات پر۔ مقتدر کئی بار اسے کہہ چکا تھا کہ وہ نقشہ کہیں اندر بیٹھ کر بھی بنا سکتا ہے مگر وہ سنی ان سنی کرتے وہیں تھا۔ کچھ لوگ بڑے بڑے گڑھے مٹی سے بھرنے میں مشغول تھے۔

"جس طرح آپ کام کر رہے ہیں' اس طرح تو زیادہ عرصہ نہیں لگے گا۔"

وہ اپنے ہر کام کو دل جمعی سے کرنے والا شخص تھا۔ کاغذات پر پیپر ویٹ رکھ کر وہ درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔ کرم داد دوڑ کر لسی کا گلاس لے آیا۔ لسی پی کر گلاس واپس کرتے اس پر نیند طاری ہونے لگی تھی۔ تین راتوں کی بے آرام نیند اور دن کی بھرپور تھکاوٹ نے اسے مضمحل کر رکھا تھا۔ کمر سیدھی کرنے کو وہ چارپائی پر لیٹا تو اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔

"انہی درختوں کے ساتھ پینگ ڈال کر جھولا جھولتے تھے ہم' تیمور بھیا اور رفیع بھائی تو بڑے تھے۔ میں اور ضیاء چونکہ جڑواں ہیں اس لیے خوب اودھم مچایا ہے ہم نے ان درختوں کے نیچے اور اوپر بھی۔"

فائقہ بہت اصرار سے اسے اپنے ساتھ لائی تھی۔ باغ میں آموں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اسے اپنے بچپن کے متعلق بتا رہی تھی دونوں باتیں کرتے کرتے کافی دور نکل آئی تھیں چاچا منور جوان کے ساتھ آیا تھا ٹیوب ویل کے پاس بیٹھا تھا۔

"چاچا منور اس وقت بڑی اچھی صحت کا مالک تھا۔ نیند میں ہوتا تو جگانا مشکل ہو جاتا۔ ضیاء اور میں ایک دوسرے سے شرط لگا بیٹھتے کہ کون چاچا کو آواز دیے بغیر جگائے گا۔ ضیاء نے ایک تنکا پکڑا اور گاہے بہ گاہے چاچا کے پیروں میں پھیرنے لگا چاچا جو ہڑبڑا کر اٹھا تو اس

کی حالت دیکھنے والی تھی۔ ہمیں دیکھنے کے بعد اس نے ہمارے پیچھے دوڑ لگادی اور ہم ہنستے ہوئے آگے آگے دوڑنے لگے۔ چاچا نے شکایت بھی لگائی ہماری اور ہمیں خوب ڈانٹ پڑی۔"

فائقہ کے ساتھ وہ بھی ہنس رہی تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ فائقہ آگے آگے اسے وہ درخت دکھانے کی کوشش کررہی تھی جس پر وہ — جھولا کرتے تھے۔

اس کی آنکھ نسوانی ہنسی کی آواز پر کھلی تھی۔ درخت کے نیچے بچھی چارپائی پر سوئے نہ جانے کتنے گھنٹے ہوگئے تھے۔ اس کے اردگرد کوئی نہیں تھا۔ شام کے گہرے سائے میں اسے سمجھنے میں مشکل ہوئی کہ وہ کہاں ہے۔ اسے ڈسٹرب نہ کرنے کے خیال سے اس کے ساتھی اسے وہیں چھوڑ کر جاچکے تھے۔ دوبارہ سنائی دی جانے والی ہنسی پر وہ اٹھ کر چپل پہننے لگا۔ اس کا رخ تھوڑی دور نظر آنے والے درختوں کے جھنڈ کی طرف تھا۔

"پھر کیا ہوا۔"

فائقہ کافی آگے نکل گئی تھی۔ ہنستے ہنستے اسے مخاطب کرتے اسے یکدم ہی بریک لگا تھا۔ سرخ سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ اسے گھور رہا تھا۔ باغ ایک سمت سے ختم ہوچکا تھا۔ سامنے کھلا میدان نظر آرہا تھا۔

"آپ یہاں کیا کررہی ہیں اس وقت۔"

اس کی بھاری آواز اور سرخ آنکھوں کو دیکھ کر ایکدم ہی اسے خوف سا محسوس ہوا تھا وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ پاؤں شاید کسی گڑھے میں پڑا تھا لڑکھڑا کر اس نے اسی کی شرٹ کا کونا پکڑ لیا مگر اسی سرعت سے چھوڑ بھی دیا اس فضول شخص کا سہارا ابھی اسے گوارا نہیں تھا۔ مضبوطی سے اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے اس نے پورے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"یہ کوئی پکنک پوائنٹ نہیں ہے۔ اور نہ ہی آپ کا شہر کہ جدھر بھی دل چاہا پھرتی رہیں۔ شام کے وقت باہر نکلنے سے گریز کیا کریں۔"

دو تین بار اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر اس کی تندی و درشتی دیکھ کر صرف لب ہلا کر رہ گئی۔ شرمندگی کے مارے اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

"تیمور بھائی آپ۔ اتنا مجبور کیا اسے پھر کہیں آئی ہے۔ اتنے دن ہوگئے اسے یہاں آئے اور ابھی تک اس نے نہ گاؤں دیکھا ہے اور نہ ہی ہماری زمینیں۔ آج کھینچ کر لائی ہوں اسے۔"

فائقہ نے اس کے موڈ کو نظرانداز کرتے رام کتھا سنائی۔

"تمہارا دماغ تو صحیح ہے۔ اندھیرا گہرا ہورہا ہے اور کوئی تمہارے ساتھ بھی نہیں اور تم اکیلی یہاں کدکڑے لگاتی پھررہی ہو۔ اتنے آدمی ہوتے ہیں یہاں۔ تمہیں پتا نہیں کہ یہاں پروجیکٹ پر کام کررہا ہوں۔"

ناگواری سے اسے دیکھتے وہ اسی پر الٹ پڑا۔

"وہ منور چاچا۔"

وہ اسی طرح سرخ سرخ آنکھوں سے انہیں گھورتا رہا۔

"چلو، چھوڑ آتا ہوں تم لوگوں کو۔"

آگے آگے چلتے اس نے حکم صادر کیا۔ اس نے تلخی سے سر جھٹکتے اپنے سے آگے چلتے اونچے لمبے مرد کو دیکھا ایک لمحے کے لیے تو اس کا دل چاہا کہ اسے کچا چبا جائے۔

"بدتمیز، جاہل، فضول، گنوار"

ایک بار پھر اس نے سوچا۔

"سلوٰی آجاؤ تھوڑی دیر کے لیے۔"

فائقہ نے حویلی کے گیٹ پر رک کر اسے اندر آنے کی دعوت دی۔

"نہیں اب میں گھر جاؤں گی شکریہ، اللہ حافظ۔"

اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

"میں چلی جاؤں گی آپ کو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

رک کر اسے کہتے اس نے تیزی سے قدم آگے بڑھا دیے یہ دیکھے بغیر کہ وہ آرہا ہے یا نہیں۔

☼ ☼ ☼

گھنے کالے بادلوں نے آسمان کو پوری طرح چھپالیا تھا۔ دور نظر آتے لمبے گھنے درخت اور کھڑی فصل ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھی درخت کبھی ایک طرف جھکتے کبھی دوسری جانب تیز ہوا کے ساتھ مٹی بھی اڑنے لگی تھی۔ سلاخیں لگی کھڑکی کھولنے پر ایک دم ہی مٹی کا ایک بگولا اڑتا ہوا اندر آگیا مگر اس نے کھڑکی بند نہیں کی تھی۔ سوکھی مٹی پر بوندوں کے گرنے سے مٹی کی سوندھی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر مٹی کی خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔ اس کے حواس پر چھائی خوشبو نے سارے دن کی تھکن کو یکدم ہی کم کردیا تھا۔

"رمضان اگر کوئی مریض ہے تو اسے اندر بھیج دو۔"

کھڑکی کے سامنے کھڑے کھڑے ہی اس نے رمضان کو آواز دی پانچ بج چکے تھے۔ پہلے وہ اس وقت تک فارغ ہوچکی ہوتی تھی آج مریضوں کا رش کچھ زیادہ ہی تھا اس لیے اسے کافی ٹائم ہوچکا تھا۔ ہسپتال کے نام پر یہاں صرف تین کمرے تھے ایک اس کے کلینک کے طور پر استعمال ہوتا دوسرا مریضوں کے لیے تھا اور تیسرے میں دوائیاں وغیرہ رکھی تھیں۔ دوسرے کمرے میں جھانکنے پر اسے کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ نہ کوئی مریض اور نہ ہی رمضان۔ رمضان چودہ پندرہ سال کا لڑکا تھا جو پیون کا کام کرتا تھا۔ سکینہ آج چھٹی پر تھی۔ سکینہ ساتھ کے گاؤں میں رہتی تھی اس نے نرسنگ کا کورس کررکھا تھا اور اس کے آنے سے پہلے اسے بھی اپوائنٹ کرلیا گیا تھا۔ اس کی ساس اسے کل دوپہر ہی میں آکر لے جاچکی تھی۔

"نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔"

خود سے بولتے اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں بادل گہرے ہوکر نیچے جھک آئے تھے۔ موسم کئی دنوں بعد خوش گوار ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنکھیں میچ کر اس نے دکھتی آنکھوں کی تھکاوٹ دور کرنے کی کوشش کی۔ باہر سے آتے ہوا کے ٹھنڈے جھونکے جیسے لوری سنا رہے تھے اٹھنے کو بالکل دل نہ چاہ رہا تھا۔

"باجی بارش آنے والی ہے۔ جلدی سے آجائیں۔ اگر تیز بارش آگئی تو مشکل ہوجائے گی۔ کیچڑ کی وجہ سے چلنا مشکل ہوجاتا ہے۔ پانی اتنا اتنا کھڑا ہوجاتا ہے گلیوں میں، ویسے بھی بادلوں سے لگ رہا ہے خوب بارش ہوگی آج۔"

رمضان کی ہانپتی آواز پر وہ فوراً سیدھی ہوئی۔ گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس رمضان شاید دور سے بھاگ کر آرہا تھا۔

"تم کہاں تھے۔"

"وہ جی میری اماں بیمار تھی کل آپ سے دوائی بھی لی تھی اس نے اسی کا پوچھنے گیا تھا گھر، مریض بھی کم ہی رہ گئے تھے۔ آپ سے پوچھا بھی نہیں۔"

رک رک کر اسے بتاتے وہ شرمندہ شرمندہ سا تھا۔

"اب ٹھیک ہیں وہ۔"

اس کی شرمندگی دور کرنے کو اس نے ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔

"جی بھلی چنگی ہیں اب تو۔"

"یہ تالا لگاؤ، اگر بتا کر جاتے تو وہیں رہ جاتے واپس آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

بیگ اور میڈیکل باکس اٹھاتے اس نے اسے تالا لگانے کا کہا۔ رمضان کے تالا لگاتے لگاتے ہی بوندوں کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ہوا بھی زور پکڑتی جارہی تھی۔

"باجی لائیں یہ مجھے دیں۔ میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں موسم ٹھیک نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر پہلے کی شرمندگی دور کرنے کو اس نے اپنی خدمات پیش کیں اور باکس اس کے ہاتھ سے لینا چاہا۔

"میں چلی جاؤں گی۔ تم اپنے گھر جاؤ تمہیں واپس آنے میں مشکل ہوگی۔ تھوڑا سا تو راستہ ہے۔ بارش تیز ہونے سے پہلے میں گھر پہنچ جاؤں گی۔"

قطعیت سے کہتے اس نے قدم آگے بڑھایا۔ موسم کے تیور خطرناک تھے مگر وہ پریشان نہیں تھی۔ اسے جو گھر دیا گیا تھا وہ آبادی میں تھا جب کہ یہ ہسپتال آبادی سے ذرا دور تھا اس لیے رہائش اس سے الگ رکھی گئی تھی۔

"لیکن باجی۔"

رمضان گومگو کی کیفیت میں ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ اسے نظر انداز کر کے اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے چھاجوں مینہ برسنے لگا تھا۔ شرابور تو وہ ہو ہی چکی تھی کھڑے ہونے کی بجائے اس نے چلتے رہنے کا فیصلہ کیا تھا تیز بارش اور کیچڑ کی وجہ سے چلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی سنبھل سنبھل کر چلتے بھی ایک سینڈل پاؤں سے اتر چکا تھا۔ اس نے نیچے جھک کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی تھوڑی دیر پہلے شروع ہونے والی تیز بارش نے ہر طرف جل تھل کر دیا تھا پانی اور کیچڑ میں آخر وہ سینڈل تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔ چلنا دشوار تھا تو رکنا اس سے بھی زیادہ دشوار۔

"کیا مصیبت ہے۔"

ایک ہاتھ میں سینڈل دوسرے میں میڈیکل باکس سنبھالتے وہ عجیب مصیبت میں تھی۔ پگڈنڈی والے شارٹ کٹ کو اختیار کرنے کی بجائے اس نے گلیوں والا قدرے لمبا راستہ چنا تھا۔ گھر زیادہ دور نہیں تھا مگر اس وقت اسے یہی فاصلہ سو کوس محسوس ہو رہا تھا۔

"مجھے وہاں سے نکلنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

خود کو کوستے وہ چھپڑ چھپڑ قدم اٹھاتی رہی۔

"ہاں وہیں بیٹھی رہتی اور رات ہو جاتی، میرے ابا بیٹھے ہیں نا یہاں جو مجھے آ کر لے جاتے۔"

خود کو کوستے، جھنجلاتے وہ گرتی پڑتی آگے بڑھتی رہی۔

"آئیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

گاڑی کب رکی اور اتر کر کب اس کے پاس آیا اسے اپنی سوچوں میں بالکل علم نہ ہو سکا تھا۔ وہ ہونق انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی جو تھوڑی دیر میں پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ پہلے کی دو تین ملاقاتوں کی طرح وہ آج بھی سفید کپڑوں میں ملبوس تھا، غیبی مدد آ چکی تھی مگر "مدد" کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ اس کا لہجہ مہذب ہی تھا مگر نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر اسے چڑ سی ہونے لگتی تھی۔ اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھ میں پکڑی سینڈل پر پڑی اور اس نے غیر محسوس انداز میں اسے اپنے پیچھے چھپا لیا۔ چلنا دشوار تھا تو اس کے ساتھ جانا اعصاب پر ایک بوجھ۔

"ایسا فیثا غورث کا مسئلہ حل کرنے کو نہیں کہا میں نے کہ آپ سوچ بچار میں پوری زندگی گزار دیں۔"

جلے انداز میں کہہ کر اس نے قدم گاڑی کی جانب بڑھا دیے وہ نہ جانے کیوں انگارے چبائے بیٹھا تھا۔

"جاہل، بدتمیز۔"

ہمیشہ کی طرح اس کے ذہن نے اسے القابات سے نوازا۔ اس کے جلے انداز کو نظر انداز کر کے وہ ابھی تک اس کے لفظوں پر غور کر رہی تھی۔

"آپ فیثا غورث کو جانتے ہیں۔"

ایک ہاتھ میں سینڈل پکڑے اسے اپنے احمقانہ سوال کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ سوال میں حیرت اس قدر تھی کہ وہ جاتے جاتے مڑ گیا۔

"ہاں میرے ساتھ کھیلتا رہا ہے۔"

اس کی جہالت پر اسے کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ سنجیدگی سے جواب دے کر وہ اسے دیکھتا رہا۔ سرخ و سفید چہرے پر پڑے بارش کے قطرے عجب بہار دکھا رہے تھے۔ چہرے پر چپکے بال اس کے سفید رنگ کو اور نکھار رہے تھے۔ گال پر پھسلتے قطرے اور حیرت سے پھیلی براؤن آنکھوں کو دیکھتے ہی نہ جانے کیا ہوا تھا۔ اس نے ایک دم ہی نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔ نہ جانے ایک دم ہی کیا ہوا تھا۔ دل اور آنکھیں ہمک ہمک کر اسے دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ اس نے رخ پھیر کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"آپ مذاق کر رہے ہیں۔ ہے نا۔"

اس کے انداز اور معصومیت پر اسے ہنسی آ گئی مگر وہ لب دبا گیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ جس راستے پر چلنا اسے صدیوں کے برابر لگ رہا تھا گاڑی میں اسے عبور کرتے دو منٹ بھی نہیں لگے تھے۔ گیٹ کے سامنے کھڑی وہ کتنی دیر خالی الذہنی کی کیفیت کا شکار رہی تھی۔ سر جھٹک کر اس نے گویا ہر خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی شخصیت پر کشش تھی جس کو مانتے ہوئے بھی وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔

رعب دھونس اور کروفر نے ہمیشہ اس کے متعلق اس کی مثبت سوچوں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ لیکن پلنگ پر لیٹتے ہی اپنے دھونس والے انداز سمیت وہ پھر سامنے آ گیا۔

اس کے بابا بہت نرم مزاج تھے اونچی آواز میں کبھی اس نے ان کو بولتے نہیں سنا تھا اور وہ ان کی ضد تھا بھاری آواز میں رعب تھا نرمی جو اس کے چہرے سے جھلکتی تھی کبھی اس کی آواز میں نظر نہ آئی تھی۔ اسے لڑکیوں کے سامنے بچھ بچھ جانے والے مردوں سے بھی چڑ تھی۔ وہ فرقان حمید جو اس کا کلاس فیلو تھا اور جس کی جی حضوری کا لطف دو سال تک پوری کلاس نے لیا تھا اسے زہر لگا کرتا تھا۔ اپنی ساری اسائنمنٹس اس کے حضور پیش کرنے کو ہر وقت تیار، اس کے مائیگریشن پر اس نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

"لیکن میں اس کا موازنہ کیوں کر رہی ہوں اس جیسے چودھری ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اسی لیے رعب خود ہی ان کے لہجے سے جھلکنے لگتا ہے۔"

اس کی منفی سوچوں نے اسے پر سکون کر دیا۔ کروٹ بدل کر اس نے سونے کی کوشش شروع کر دی۔ بارش کی ٹپ ٹپ ساری رات کھڑکی سے اندر آتی رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر باہر دیکھے مگر اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ صحیح ہے کہ پھپھا نے جو کیا بالکل غلط کیا مگر اس میں نسرین پھپھو اور فہمی کا کوئی قصور بہت تلاش کرنے پر بھی نہیں نظر آتا۔ اگر میں آپ کے فیصلے پر مہر لگاتا ہوں تو اس میں اس شخص کا کچھ بھی بگڑنے والا نہیں ہے۔ وہ عورتیں جو ساری زندگی آپ جیسے حاکم مردوں کے فیصلے تلے پستی رہی ہیں ان کی زندگی عذاب ہو جائے گی اس لیے میں ایسا کچھ نہیں کر رہا۔"

وہ بہت نرم خو تھا اور باپ کے سامنے شاید پہلی بار سر اٹھا کے اتنی لمبی بات کر رہا تھا۔ لیکن اس کی گفتگو اتنی مدلل تھی کہ کچھ دیر کے لیے رزاق چودھری بھی چپ کے چپ رہ گئے تھے۔ ساری زندگی وہ ان کی باتوں پر کڑھتا رہا تھا۔ اپنے باپ کی دوسروں کو ذلیل کر کے حاصل ہونے والی خوشی اسے کبھی خوش نہ کر سکی تھی وہ سچ کا ساتھ دینا چاہتا تھا مگر اپنی ساری زندگی اس نے بند لبوں کے ساتھ گزار دی تھی لیکن اب ایسا ممکن نہیں رہا تھا۔

"اس رشتے کو طے کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ آپ کا اور بے جی کا تھا اب جبکہ وہ میری عزت ہے میں ایک انچ بھی اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہیں۔"

اسے اس سے محبت نہیں تھی اس سے انسیت بھی نہیں تھی مگر وہ ہر چیز کو کالے شیشوں والی عینک سے بھی دیکھنے کا عادی نہیں تھا۔ نکاح ہوا تھا محبت بھی ہو جاتی مگر گھر بیٹھے کسی اور کے کیے کی سزا اسے دے دینا اسے گوارا نہیں تھا۔

"بند کرو اپنی یہ بکواس۔"

وہ ایک دم ہی آپے سے باہر ہو گئے۔ وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹے تھے اگر درمیان میں انیس نہ آ جاتا تو نہ جانے وہ کیا کرتے۔ بے جی بھی سراسیمہ ہو کر ان کی جانب بڑھیں۔

"کل تک کا وقت دے رہا ہوں میں تمہیں۔ باپ کو ذلیل کرنے والے شخص کی حمایت کا بڑا شوق چڑھ رہا ہے نا تمہیں۔ اگر تم کل تک میری بات مان لیتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ ہر طرح کے نقصان کے ذمہ دار صرف تم ہو گے صرف تم۔"

کف اڑاتے، انیس کے ہاتھوں کو جھٹکتے انہوں نے ایک دم ہی اسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ نفرت سے ہونٹوں کو سکیڑتے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ کمرے میں

موجود ہر شخص اپنی اپنی سوچ میں مگن تھا۔ انہیں سمجھانے کی ساری کوششیں بے کار گئی تھیں "میں" کے آگے سب کچھ ہیچ تھا بہن اور بھانجی کی اجڑی مانگ اور آنسوؤں سے لبریز آنکھیں بھی۔

حویلی میں ہونے والی بدمزگی نسرین اور فہمی تک بھی پہنچ گئی تھی۔

"بھابھی میں کیا کروں مجھے تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔ ساری زندگی مر مر کر گزاری ہے۔ جی تو کرتا ہے اس زندگی کی نام نہاد قید سے خود کو آزاد کرلوں ۔ بیٹی کی اجڑی مانگ جو بسنے سے پہلے ہی اجڑنے کو ہے۔"

سلمٰی، صفیہ خاتون کے ساتھ لگی اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔

"ایک طرف بھائی ہے تو دوسری طرف۔"

ان کے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ صفیہ انہیں دلاسا دیتے خود بھی ان کے ساتھ رونے لگیں۔ عورتوں کی قسمت میں ہمیشہ رونا ہی کیوں لکھا ہوتا ہے

"نذیر احمد کا کہنا ہے اچھی بات ہے نہ آئیں بارات لے کر اگر آئے بھی تو ہم رخصتی نہیں کریں گے۔ بلکہ ذلیل کر کے باہر نکال دیں گے۔"

درپیش صورت حال نے واقعی ۔ ہر ایک کے ہوش اڑا دیے تھے۔ دونوں گھرانوں نے وہ پہاڑ سی رات جاگتی آنکھوں کے ساتھ گزاری تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ اسکول نہیں جاتے۔"

سلویٰ نے اپنے ساتھ چلتے صابرہ کے بیٹے کو دیکھا جو جمائی روکنے کی کوشش میں بے حال ہوا جا رہا تھا۔ سات آٹھ سال کا یہ پیارا سا لڑکا دو دن سے اس کے ساتھ آرہا تھا۔ بابا کے ساتھ واک کرنے کی عادت بہت پرانی تھی۔ یہاں آنے کے بعد کچھ دن وہ واک نہیں کر سکی تھی مگر روٹین پر واپس آتے اسے بہت زیادہ دن نہیں لگے تھے۔ دو دن سے وہ شاہد کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے آتی آج اسے اس پہ بہت ترس آرہا تھا۔

"پہلے جاتا تھا اب نہیں جاتا۔"

اس کی آواز بھاری سی ہو رہی تھی۔

"کیوں اب کیوں نہیں جاتے۔"

صبح کی سہانی فضا اور تازہ ہوا کو اندر کھینچتے اس نے پھر اسے دیکھا جو اس کے سوالوں سے اکتایا ہوا تھا۔

"جب سے ابا مرا ہے میں اسکول نہیں جاتا۔ دادی نے ہمیں گھر سے نکال دیا تو چھوٹے ملک صاحب نے جگہ دی بعد میں آپ کے پاس آگئے۔"

اسے اس کا جواب سن کر افسوس ہوا تھا۔ بچے کے لہجے کی اکتاہٹ اور لاتعلقی محسوس کر کے اس نے اسے گھر بھیج دیا تھا گاؤں میں زندگی بہت جلدی شروع ہو جاتی تھی مگر شاید وہ اتنی جلدی جاگنے کا عادی نہیں تھا۔ کچے راستے پر چلتے وہ چڑیوں کی چہچہاہٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا مگر ہر طرف روشنی ہو چکی تھی۔ دو دن پہلے ہونے والی ہلکی بارش سے حبس بھی محسوس ہو رہا تھا مگر وہ چلتے چلتے کافی دور نکل آئی تھی۔ کچے پکے گھر، کھیت، ہریالی ہر چیز مسحور کن تھی۔ جتنا وہ آنے سے پہلے چڑچڑے پن کا شکار تھی اب اتنی ہی مطمئن تھی اس کا دل لگ گیا تھا اگرچہ اس کی سوشل لائف تقریباً" ختم ہو کر رہ گئی تھی مگر اسے مریضوں ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اسے اس کام میں لطف آنے لگا تھا۔ سادہ مگر زندہ دل لوگ، بے ریا چہرے، محبت کرنے والے دل، اس نے ایک لمبا سانس کھینچ کر سبزے کی خوشبو کو محسوس کیا اور آگے بڑھتی رہی۔ نہر کے اطراف میں لگے درخت اور درختوں کی پانی کو چومتی شاخیں، سست روی سے چلتا نہر کا پانی ہر چیز کتنی مکمل اور خوب صورت تھی۔

"یا اللہ!"

وہ نظاروں میں اتنی مصروف تھی کہ دور سے دوڑتے کتے کو اپنی طرف آتے نہیں دیکھ پائی تھی اور جب دیکھا تو خوف سے منجمد ہونے لگی۔ پوری قوت لگا کر اس نے مخالف سمت میں دوڑنا شروع کر دیا۔ گاہے بگاہے وہ پیچھے بھی دیکھ لیتی۔ اس کا سانس

پھولنے لگا تھا اچانک کتے کی رفتار تیز ہوئی اور کتا اس سے بھی آگے نکل گیا۔ پہلے اس نے دوڑنا بند کیا اور پھر اس عجیب بات پہ سوچ کر اسے ہنسی آگئی۔

"گویا ڈبو صاحب میرے ساتھ ریس لگا رہے تھے۔"

اسے بڑی زور کی ہنسی آئی اور پھر وہ ہنستی چلی گئی۔ اس نے اپنی ہنسی روکنے کی بالکل کوشش نہیں کی تھی ۔ ہنستے ہنستے اسے اپنے پاس کسی کے موجود ہونے کا احساس ہوا تھا۔ سفید ٹریک سوٹ میں تیمور اسے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔ پہلے اس کی ہنسی کو بریک لگا پھر گھبراہٹ اور شرمندگی نے گھیر لیا۔

"وہ کتا میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ لیکن دوڑتے دوڑتے وہ مجھ سے بھی آگے نکل گیا۔"

شرمندگی اور گھبراہٹ میں منہ سے نہ جانے کیا اول فول نکل رہا تھا۔

"یہ بدتمیز شخص ہمیشہ ہی اس جگہ کیوں موجود ہوتا ہے جہاں کہیں میری سبکی ہو رہی ہو۔"

"ہاں جی کتا جو ہوا بے چارہ۔"

"کتا اور بے چارہ" اس نے کھینچ کر ادا کیا تھا۔ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس نے مذاق کیا تھا یا ہمدردی، لیکن اسے یکدم ہی غصہ آگیا تھا۔ اسے نظرانداز کر کے اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ اسے لگا جیسے وہ کتے کے ساتھ ہمدردی کر رہا ہو۔

"یہ آپ کا شہر نہیں ہے کہ جدھر دل چاہا منہ اٹھا کر چل دیں۔ بہتر ہے کہ آپ آئندہ اس طرح کی ویران جگہوں پر آنے سے گریز کریں۔"

اس کے اٹھتے قدم اس کی بات سن کر وہیں رک گئے۔ غصے سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔

"ہسپتال میں نوکری کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ہر قدم آپ کے کہنے پر اٹھاؤں۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے کچھ بھی کہنے والے۔"

کڑے تیوروں سے اسے گھورتے اس نے اس کی کھلتی بند ہوتی مٹھیوں اور ماتھے پر بنی شکنوں کو نظر انداز کر دیا۔

"میں منہ اٹھا کر چلوں یا منہ گرا کر آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔"

اپنے خیال میں اسے سیدھا کرنے کے بعد وہ وہاں رکی نہیں تھی۔

وہ اسے آرام سے بھی سمجھا سکتا تھا۔ گاؤں کی زندگی شہروں سے مختلف ہوتی ہے مگر اسے دیکھتے ہی ایک جھلاہٹ سی اس پر سوار ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا وہ اسے اچھی لگتی تھی اور یہ کوئی اب کی بات نہیں تھی۔ لیکن وہ اسے بتا نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر چیز سے لاپروا تھی یہاں تک کہ خود سے بھی لیکن اس کے انداز اسے مشکل میں ڈال دیا کرتے ۔

وہ منہ پھٹ تھی کسی کے رعب میں نہیں آتی تھی وہ اسے رعب میں رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اس سے بات کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تو ہونا چاہیے تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں آپ کو لینے آیا ہوں فہمی۔ سارے حالات آپ کے علم میں ہیں جو پھپھا نے کیا اور جو بابا چاہتے ہیں دونوں صورتیں آپ کے سامنے ہیں۔ میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ کل بارات نہیں آئے گی اور اگر آ بھی گئی تو رخصتی نہیں ہوگی۔ آپ میری ذمہ داری ہیں اس لیے میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

سرخ رنگ کے دہکتے کپڑوں میں ملبوس فہمی اسے وہاں دیکھ کر حواس باختہ سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ توثیق سر اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا برآمدے میں اس کے ساتھ بیٹھی عورتیں اسے ہی دیکھے جا رہی تھیں۔ اس دیدہ دلیری کی توقع کسی کو بھی نہیں تھی۔

تھوڑی دیر پہلے نسرین بیگم کا جھگڑا نذیر احمد چودھری سے ہوا تھا اور وہ بکتے جھکتے باہر نکل گئے تھے۔ نسرین نے پہلی بار ہی ان کے سامنے لب کشائی کی تھی۔ وسیم اور ندیم نے ماں اور بہن کا ساتھ نہیں دیا تھا نہ ہی باپ کو کچھ کہا تھا ان کا رویہ روایتی زمین داروں جیسا تھا۔

فہمی کاٹوتو لہو نہیں کی تفسیر بنی وہیں ساکت کھڑی تھی۔ ایک کم اعتماد دیہاتی لڑکی کیا فیصلہ کرنے کی حیثیت رکھتی تھی۔

"پتر تو۔"

نسرین باہر نکلیں اور صحن کے بیچوں بیچ اپنے ہونے والے داماد کو کھڑے دیکھ کر ہانپتی ہوئی اس کی طرف دوڑیں۔ اگر کوئی اسے یہاں دیکھ لے۔ اس کا مطالبہ ان کے ہاتھ پیر پھلا گیا وہ سر پکڑ کر وہیں بیٹھتی چلی گئیں۔ صرف عتیق بھیا جانتے تھے کہ وہ یہاں آیا ہے ورنہ حویلی کے کسی فرد کو علم نہیں تھا۔ لرزتی ٹانگوں اور ڈولتے دل کے ساتھ فہمی نے ایک بار سامنے کھڑے مضبوطی سے جمے مرد کو دیکھا جو اپنی شخصیت میں ایسی کشش ضرور رکھتا تھا کہ اس کے لیے دنیا ٹھکرا دی جائے مگر......

نسرین نے لرزتے لہجے میں سوال کیا تھا مگر اس سوال کے کھوکھلے پن کا انہیں خود بھی اندازہ تھا۔

"کل کا سورج نہ جانے اپنے ساتھ کیا کچھ لانے والا ہے۔ بابا کی عادت سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر میں طلاق دیے بغیر چلا جاتا ہوں تب بھی وہ مجھے ایسے ہی نہیں رہنے دیں گے اور اگر ان کو لے کر جاتا ہوں تب بھی وہ مجھے عاق ضرور کریں گے ہو سکتا ہے کچھ اور بھی...... دولت میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہاں سچ کی طمانیت جو سچ کا ساتھ دینے سے حاصل ہوتی ہے۔"

وہ مضبوطی سے اپنے موقف پر قائم تھا۔ عتیق بھیا باہر گاڑی میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ زمین پر بیٹھی نسرین بیگم اس بات سے بے نیاز تھیں کہ وہ آن بان والی چودھرانی ہیں اور سامنے کھڑی فہمی حقیقت میں کچھ بھی سوچنے کے قابل نہ رہی تھی۔ اس نے تو زندگی میں کبھی کچھ بھی سوچا نہ تھا کوئی فیصلہ اس کا اپنا نہ ہوتا سارے فیصلے بابا یا بھائیوں کے ہی چلا کرتے تھے بھلا وہ کیسے اتنا بڑا فیصلہ خود ہی کر لیتی۔ ہر طرف ایک محسوس کی جانے والی خاموشی طاری تھی۔ توفیق نے آگے بڑھ کر فہمی کا بازو پکڑا اسے برآمدے سے صحن میں کھینچا اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھنے لگا وہ ایک روبوٹ کی طرح اس کے ساتھ کھنچی چلی جا رہی تھی۔

"ٹھہرو توفیق۔"

نسرین پھپھو کی آواز پر اس کے اٹھتے قدم جم سے گئے۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

"تم دونوں کو اللہ کی امان میں دیا۔"

ہاتھ میں پکڑی بڑی سی چادر انہوں نے فہمی کو اوڑھا دی۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ انہوں نے اسے ساتھ لگایا۔

"کیا کرنے آئے ہو تم یہاں تمہیں ہمت کیسے ہوئی!"

ندیم چودھری ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑا تھا۔ آنکھوں سے نکلتی چنگاریاں اسے بھسم کرنے کو تھیں

"اپنی امانت لینے آیا ہوں اور ہمت ہمارے رشتے نے بخشی ہے۔" نڈر اور بے خوف انداز میں کہتے اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

"بند کرو اپنی یہ بکواس' ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو جان سے مار دوں گا تمہیں بھی اور...... اسے بھی۔"

وہ پستول لینے اندر کی جانب دوڑا۔ اس کی آنکھوں اور انداز سے جھلکتی سفاکی اور درندگی پر فہمی نے ایک جھرجھری لے کر اس سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"میں نے بلایا ہے اسے یہاں اور میں نے ہی کہا ہے فہمی کو لے جانے کے لیے۔ مری نہیں ہوں ابھی زندہ ہوں میں۔" بھاگ کر اندر جاتے ندیم کا راستہ روک کر کھڑی نسرین پہلی مرتبہ شاید اس لہجے میں بات کر رہی تھیں۔

"پیچھے ہٹیں آپ۔"

ندیم نے ایک ہاتھ سے دھکیل کر انہیں پیچھے کرنا چاہا۔

"جاؤ پتر تم دونوں یہاں کیوں کھڑے ہو۔"

اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے انہوں نے فہمی اور توفیق کو دیکھا جو ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔ انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ ندیم دوڑ کر اندر جا چکا تھا انہوں نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ فہمی نے آخری نظر ماں اور گھر پر ڈالی اور توفیق کے ساتھ قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔ ندیم دروازہ دھڑ دھڑاتے گالیاں بک رہا تھا۔ دھمکیاں دے رہا تھا۔ انہیں رخصت کر کے وہ برآمدے میں پڑے تخت پر ڈھے گئیں۔

☼ ☼ ☼

جہازی سائز پلنگ پر کروٹیں بدلتا وہ اسے سوچ رہا تھا۔ اپنی بے چینی کی وجہ اسے پوری طرح سمجھ نہ آ سکی تھی مگر یہ ضرور اندازہ ہو گیا تھا کہ بے چینی کا تعلق اسی دشمن جان کے ساتھ ہے۔ وہ اس سے چڑتی ہے یہ تو وہ جانتا تھا اور شاید اسے چڑانے کے لیے ہی کبھی کبھار اس طرح کی حرکتیں بھی کرتا تھا مگر کچھ دنوں سے اس کی ہر سوچ کا محور صرف وہی ہو کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے وہ اسے کیا سمجھتی تھی اس سے کبھی لمبی گفتگو نہیں ہوئی تھی اور جتنی بھی ہوئی تھی اس سے اسے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اسے پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھتی۔ ڈاکٹر حشمت کے آفس میں اسے دیکھ کر کسی لڑکی کے اتنا بولنے اور اکیلے بولنے پر حیرت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر حشمت نے خاص طور پر اسے اس سے ملوانے کے لیے بلوایا تھا اسے دیکھنے کا اشتیاق خود بخود ہی پیدا ہو گیا تھا وجہ صرف ہسپتال نہیں تھا بلکہ ان دونوں کے درمیان موجود رشتہ تھا جو وہ بالکل نہیں جانتی تھی اور اس کے بعد ہونے والی ملاقاتوں میں وہ اس پر کوئی اچھا تاثر چھوڑنے میں ناکام رہا تھا۔

بے چینی سے ایک بار کروٹ بدلی پھر دوسری اور آخر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سناٹے کو چیرتی جھینگر کی آوازیں فضا کو عجیب پراسراریت بخش رہی تھیں۔ سگریٹ سلگا کر اس نے وقت دیکھا رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ اس کے ذہن میں اس دن کا منظر تازہ ہو گیا۔

بارش برس رہی تھی اور خوب برس رہی تھی لگتا تھا بارش صرف آج ہی ہو گی اس کے بعد نہیں۔ اس دن بابا اور رفیع بھائی نے اسے فیکٹری دکھانے کے لیے بلایا تھا واپسی پر اس نے اسے دیکھا تھا جو بارش میں بھیگتی' گرتی' پڑتی اپنے راستے سے دائیں طرف چل رہی تھی اور یہ ہمدردی ہی تھی کہ اس نے اسے گاڑی میں چھوڑ دینے کی دعوت دی تھی اور اس کے سوال پر اور پھر سوچنے پر اسے ایک دم ہی کوفت اور غصہ آ گیا تھا مگر اس کے سوال نے اس کے احمقانہ پن پر مہر لگا دی تھی یا شاید وہ اسے جاہل سمجھتی تھی۔ مگر بارش میں اس کے چہرے پر پڑے قطرے دیکھ کر اسے ایک دم ہی عجیب سا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کی ہے اور اتنی پیور اور خالص' اس کا دل چاہا تھا کہ اسے اٹھا کر اسی وقت گھر لے جائے لیکن ابھی وقت نہیں آیا تھا اور اسے بڑے صبر و برداشت سے اس وقت کا انتظار کرنا تھا۔ لیکن بعد کی ملاقاتوں میں اس کی ہٹ دھرمی نے صحیح معنوں میں اسے تپا دیا تھا۔ جتنا اس نے اسے ویران جگہوں پہ جانے سے منع کیا تھا اتنا ہی وہ ایسی جگہوں پر دندناتی ہوئی پائی جاتی تھی۔

"آپ کون ہوتے ہیں اور اپنے کام سے کام رکھیں۔" ایسے جملے تھے جنہوں نے صحیح معنوں میں اسے آؤٹ آف کنٹرول کرنا چاہا تھا۔

کون ہونے کا مطلب وہ اسی دن اسے اچھی طرح بتا دینا چاہتا تھا مگر اس نے خود پر جبر کر لیا تھا یہ شاید محبت تھی جو اسے خود بخود ہو گئی تھی کہ وہ اس کی سخت باتوں پر بھی چپ کر جاتا تھا۔

یہ نہیں تھا کہ اس نے اب تک کسی لڑکی سے دوستی نہیں کی تھی یا کسی لڑکی کو قریب سے دیکھا نہیں تھا لیکن یہ لڑکی ان سب لڑکیوں سے مختلف تھی اور یہی انفرادیت تو اسے گھائل کر گئی تھی۔ بہت پہلے اس نے اپنے باپ سے ایک وعدہ کیا تھا اور اسے اس وعدے کو ہر صورت ایفا کرنا تھا یہ اس کا خود سے بھی وعدہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم اس وقت یہاں۔"

عثمانی اسے اس وقت اس لپٹی لپٹائی لڑکی کے ساتھ اپنے گھر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس کی بارات میں شامل ہونے کے لیے وہ بیگ پیک کر چکا تھا۔ اس کے بہت کہنے پر بھی اس کی مہندی میں مصروفیت کے باعث شریک نہیں ہو سکا تھا اس لیے ابھی گھر ہی میں تھا۔

"خیریت ہے نا سب توفیق۔" اب کے حیرانی پریشانی میں بدل گئی تھی۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔"

صوفے پر بیٹھتے اس نے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میں سلیمہ کو بلاتا ہوں۔" عثمانی جلدی سے اندر چلا گیا۔

"سلیمہ! بھابھی کو اندر لے جاؤ۔"

سلیمہ، فہمی کو لے کر اندر جا چکی تھی۔ اس نے نظر کا چشمہ اتار کر انگلیوں سے آنکھیں دبائیں۔

"ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے۔ جو اس وقت۔"

اور پھر اس کے بات کرنے پر وہ خاموش ہی رہا تھا۔ اسے سننے کے بعد بولا تھا۔

"تمہارا اپنا گھر ہے جب تک چاہو رہو، میں ابھی سلیمہ سے کہہ کر کمرہ ٹھیک کروا دیتا ہوں۔"

"ہماری زندگی کا آغاز اس طرح نہیں ہوا جس طرح ہونا چاہیے تھا جس طرح میں نے سوچا تھا یقیناً" آپ نے بھی ایسا نہیں سوچا ہو گا۔"

اس نے بیڈ کے انتہائی کونے میں سمٹی فہمی کو دیکھا جو ہولے ہولے لرز رہی تھی کبھی کبھار کمرے کی خاموش فضا میں اس کی سسکیاں بھی سنائی دے جاتیں چہرے پر دونوں ہاتھ رکھے وہ رو رہی تھی۔ ہولے ہولے چلتا وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹا کر اس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"جس طرح ہم سوچتے ہیں اس طرح تو بہت کم ہوتا ہے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو ابھی بھی شفاف قطروں کی صورت گر رہے تھے۔

"ہمارا بچپن، لڑکپن، جوانی ایک دوسرے کے سامنے گزرا کبھی ایسا سوچا بھی نہیں تھا مگر جب ایسا سوچا تو یہ ضرور فیصلہ کیا تھا کہ ہماری زندگی بے جی بابا اور پھپھا، پھوپھی سے مختلف ہو گی۔ جتنی عزت اور احترام کسی کو دیا جانا چاہیے آپ کو بھی وہی دینے کا ارادہ تھا لیکن شاید قدرت کو ہمارا وہاں رہنا ہی منظور نہیں تھا۔"

اس کی ہمدردی پا کر اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔

"کیا آپ کو افسوس ہو رہا ہے۔"

اسے اتنی شدت سے روتے دیکھ کر اسے ایک ہی بات یاد آئی تھی۔

منہ سے بولنے کی بجائے اس نے تیزی سے سر ہلا دیا۔ اس کے انداز پر ایک خوب صورت مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

"میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی۔"

اس کی دھیمی گمبھیر آواز کی لے یکدم ہی بدلی تھی۔ اس کا چہرہ یکدم سرخ ہوا اور وہ اس سے ہاتھ چھڑوا کر تیزی سے پیچھے ہو گئی۔ اس نے جھجکتے ہوئے اسے دیکھا جسے ہمیشہ اس نے سنجیدہ اور سوبر انداز میں ہی دیکھا تھا۔ وجیہہ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔

"اس سے تو اچھا تھا کہ میں وہی پرانا قصہ جاری رکھتا کم از کم وہ خوب صورت لڑکی میرے پاس تو بیٹھی رہتی۔"

زیر لب مسکراتے اس نے پوروں سے اس کے گالوں پر ٹھہرے آنسو صاف کیے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

اس نے کبھی اس طرح گھر چھوڑنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ طلاق کی صورت میں بھی اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے تازیانہ بن جاتی اور اگر وہ طلاق نہ دیتا تو بھی تکلیف صرف اسے ہوتی "میں اور انا" کی لڑائیوں میں استعمال ہونے والی عورتوں کو چودھریوں نے کبھی درخور اعتنا نہ جانا تھا اور اس کے باپ کی انا کا پرچم تو کبھی بھی سرنگوں نہیں ہوا

تھا۔ بیٹی کے لیے بھلا وہ یہ کیسے کرتا۔

☼ ☼ ☼

"عجیب جنگلی شخص ہے ہر ایک کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے۔ اس کا بس چلے تو ایک چارٹ گاؤں کے داخلی دروازے پر لکھ کر لٹکا دے کہ اس گاؤں میں داخل ہونے والوں کو کب سونا ہے کب جاگنا ہے کہاں جانا ہے کہاں نہیں جانا ہے کیا کھانا اور کیا پینا ہے۔"

وہ بہت دنوں بعد گھر آئی تھی اور شاید بھری بیٹھی تھی۔ وہاں جانے کے بعد پہلی بار اسے کتھارسس کا موقع مل رہا تھا وہ تینوں اس کی پریڈ دیکھنے کے ساتھ ساتھ اسے سن بھی رہی تھیں۔

"اِدھر نہ جاؤ، اُدھر نہ جاؤ ہونہہ۔"

ارم، ارجمند اور مزنہ اسے سن رہی تھیں۔

"لیکن بابا تو ان کی اتنی تعریف کرتے ہیں۔ ویل مینرڈ اور پتا نہیں کیا کیا۔" ارم نے اسے اور اس کے غصے کو دیکھتے بابا کی سوچ واضح کی۔

"مجھے تو ابھی سرے سے کوئی مینوز ہی نظر نہیں آئے ویل کا پتا نہیں۔"

اس نے اس طرح مینوز اور ویل چبایا جیسے اسے دانتوں تلے چبا رہی ہو۔ اس کے انداز پر وہ تینوں کھی کھی کرنے لگی تھیں۔

"آپی شکل و صورت کے کیسے ہیں یہ موصوف۔"

ارجمند نے اسے نہیں دیکھا تھا اس کی باتوں نے یک بیک ہی اسے تجسس میں مبتلا کر دیا تھا اس کے سوال میں اشتیاق تھا۔

"شکل...... بس ٹھیک ہی ہے۔"

ناگواری اور بے زاری سے جواب دیتے وہ مزنہ کے پاس بیٹھ گئی۔

"اب ایسا تو نہ کہو۔ اچھی خاصی ہیرو والی پرسنالٹی ہے۔ اونچا لمبا قد، گندمی رنگت، کھڑے نقوش اور اس پر ہیروز والا اکھڑ رویّہ۔"

ارم کو اسے چڑانے میں مزا آ رہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس کی تعریفیں اسے اور غصہ دلا رہی ہیں۔

"تم نے اس کی جاہلانہ باتیں نہیں سنیں جو اسے ہیروز سے ملا رہی ہو وہ تو شکل سے ہی ولن نظر آتا ہے۔"

وہ تینوں اس کی مبالغہ آرائی کی عادت سے خوب واقف تھیں اس لیے اسے سنتے انہیں اس کی باتوں پر اور ان کی سچائی پر یقین تھا مگر سچائی کتنی ہو گی وہ یہ بھی جانتی تھیں۔

"مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ وہ اکھڑ جاگیردار ہر بار آپ سے ہی کیوں ٹکراتا ہے یا ہر وقت آپ کی جاسوسی کیوں کرتا رہتا ہے۔"

مزنہ لبوں کا کونا دانتوں میں دبائے جیسے ایک دقیق مسئلہ سلجھانے جا رہی تھی۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر مزنہ کو اس کے سوال کی داد دی۔ وہ شاید اس سوال کا جواب تلاش کرنے کو سوچوں میں گم تھی۔

"یہی بات تو مجھے بھی سمجھ میں نہیں آتی۔"

اس کے سنجیدہ انداز سے کہنے پر ان تینوں کا قہقہہ بے اختیار نکلا تھا اور پھر وہ ہنستی چلی گئیں۔ ایک دوسرے پر گرتے وہ لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ انہیں اس طرح ہنستے دیکھ کر اس نے تکیہ اٹھا کر ان تینوں پر برسانا شروع کر دیا۔ اس کے اتنے سنجیدہ انداز میں پوچھے گئے سوال میں چھپی معنویت کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا اور اب ان تینوں کو ہنستے دیکھ کر اس کا دھیان ان کی شرارت کی طرف گیا تو تکیہ اٹھا کر ان کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اور پھر خود بھی ان کے ساتھ گر کر ہنسنے لگی۔

"مجھے تو لگتا ہے پاگل ہو گئی ہو تم سب منہ پھاڑ کر ہنسنے کی بھلا ایسی کیا بات ہے مجھے بھی تو پتا چلے۔"

فہمیدہ بیگم کی اچانک آمد پر وہ چاروں جھینپ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں اور وہ ان تینوں کو مکا دکھاتے فہمیدہ کے ساتھ ہو لی۔

☼ ☼ ☼

"میں بابا کو مکمل طور پر غلط بھی نہیں سمجھتا۔ یہ صحیح

ہے کہ ان کی بہت سی باتوں پر ہمیں ساری زندگی اختلاف رہا ہے۔ لیکن یہاں وہ غلط نہیں ہیں۔ ایک ایسے شخص کو معاف کرنے کا ظرف شاید کسی شخص میں نہ ہو جو آپ کے گھر کی عزت پر ڈاکہ ڈال رہا ہو۔"

عتیق نے سامنے بیٹھے بھائی کو دیکھا جو حویلی چھوڑ کر اس دو کمروں کے مکان میں آ گیا تھا اور اس کے چہرے پر اپنے فیصلے کا کوئی بھی پچھتاوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"مجھے تو اس بات کی سمجھ نہیں آتی کہ نذیر پھپھا نے ایسا کیا کیوں صرف بابا کو نیچا دکھانے کے لیے انہوں نے اپنی بیٹی کا بھی خیال نہیں کیا دوسری طرف نسرین پھپھو اور فہمی کو دیکھتا ہوں تو تمہارا فیصلہ صحیح لگتا ہے۔ لیکن اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کبھی بھی ایسا نہ کرتا۔ اپنی عزت سے کھیلنے والوں کو معاف کر دینا بزدلی کی نشانی ہوتی ہے۔"

توفیق نے بڑے بھائی کو دیکھا جو واقعی اس سے محبت کرتے تھے اور اسی محبت سے مجبور ہو کے اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے تھے اور کئی بار اس کے پاس بھی آ چکے تھے۔ فہمی کمرے میں ان کی باتیں سنتی پریشان تھی۔ اسے توفیق پر پورا بھروسہ تھا وہ بیچ منجدھار میں چھوڑنے والا شخص نہیں تھا مگر اپنوں کی محبت بڑے بڑوں اور بلند بانگ دعوے کرنے والوں کو بھی مجبور کر دیا کرتی ہے اور اس نے تو سرے سے کبھی محبت کا دعوا کیا ہی نہیں تھا۔

"بے جی کے سوا سب تمہارے فیصلے پر ناخوش اور ناراض ہیں اور بابا کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ اب تقریباً" سال ہونے کو ہے لیکن بابا کا غصہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا۔ جائیداد سے عاق کرنے کا اشتہار تو شاید تم نے پڑھا ہو گا۔"

انہوں نے سوالیہ انداز سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"اور سناؤ تمہاری نوکری کیسی جا رہی ہے۔"

اس کے چہرے پر اذیت کے آثار دیکھ کر انہوں نے بات بدل دی۔

"اللہ کا شکر ہے۔"

فہمی کے بھائیوں کی وجہ سے اسے دو جگہ سے ریزائن کرنا پڑا تھا۔ تیسری جگہ سے ملنے والے دس ہزار میں گزارا ہو رہا تھا۔ فہمی نے کوئی شکوہ کیا تھا اور نہ ہی اسے اپنے حالات سے کوئی شکایت تھی۔ ایک دو بار عتیق بھائی نے اسے پیسے دینے کی کوشش کی تھی مگر اس کی انا اور غیرت نے گوارا نہیں کیا تھا۔

"بھیا جب ضرورت ہوئی میں خود آپ سے مانگ لوں گا۔"

اور وہ صرف اسے دیکھ کے رہ گئے تھے۔

"جو میرے باپ نے کیا شاید ہی کبھی کسی لڑکی کے باپ نے کیا ہو اتنا شرمناک کہ توفیق کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل نہیں ہوں میں اور وہ اتنا اعلا ظرف ہے کہ اس نے جتانا تو دور کی بات کبھی اس مسئلے پر بات ہی نہیں کی۔ کتنا مختلف ہے وہ خاندان کے دیگر مردوں سے میں اگر اس سے محبت کرتی ہوں اس کی پرستش کرتی ہوں تو وہ ہے ہی اس قابل کہ اسے چاہا جائے۔ میں کہاں اس قابل تھی کہ اس جیسا مضبوط ارادوں کا مالک شخص میرا ہو۔ ہاں میں واقعی اس قابل نہیں۔"

کھڑکی سے باہر رات گہری ہو چکی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"میری وجہ سے اسے اپنی زندگی گزارنی....."

"بھئی کدھر ہو۔ آج کھانے کا کوئی پروگرام ہے یا نہیں عتیق بھائی کو روکنے کی میں نے بہت کوشش کی لیکن رات ہونے سے پہلے انہیں گاؤں پہنچنا تھا۔"

اسے پکارتے وہ اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے اسے اپنی طرف گھما لیا۔ اس نے آنسو صاف کر لیے تھے مگر ناک اور آنکھیں رونے کی چغلی کھا رہی تھیں۔

"تم پھر رو رہی تھیں۔" آنکھیں جھپک جھپک کر اس نے آنکھوں میں آتے پانی کو پیچھے دھکیلا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"میری وجہ سے آپ کے سب رشتے چھوٹ گئے۔ میں اس قابل کہاں تھی کہ آپ سب کچھ چھوڑ

کے....."

"بے وقوف لڑکی تم کس قابل ہو کئی بار تمہیں بتا چکا ہوں اگر یقین نہیں آتا تو ایک بار پھر....."

شوخ سا اشارہ کرتے وہ اس کی جانب بڑھا مقصد اسے یاسیت سے نکالنا تھا۔ مسکراتے ہوئے فہمی نے اسے پرے دھکیل دیا۔

"بہت سی چیزیں ہمارے اختیار کی حدوں سے باہر ہوتی ہیں۔ کیا ہونا ہے، کیسے اور کب ہونا ہے اسے معلوم ہوتا ہے۔ کچھ فیصلے انسان خود کرتا ہے لیکن ان فیصلوں کے کرنے میں بھی اسی کا ہاتھ ہوتا ہے۔"

وہ سنجیدہ ہو کر اسے ہمیشہ کی طرح سمجھا رہا تھا اور وہ اس کے پر اثر لفظوں کے سحر میں جکڑی اسے سن رہی تھی۔

"اگر تمہیں کوئی غلط فہمی ہے تو اسے دل سے نکال دو۔ اس بات کا برملا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں کہ نکاح سے پہلے میں نے اس نظر سے تمہیں کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اب یوں لگتا ہے کہ زندگی میں اگر تم نہ آتیں تو شاید زندگی بے رونق ہوتی تم نے مجھے محبت کرنا سکھایا ہے۔ بس اس محبت کو کبھی کم نہ ہونے دینا۔"

وہ اس کے چہرے پر لکھی سچائی کو تکتے اس کے لفظوں پر غور کرتی رہی۔

"وہ دیکھو ہماری بیٹی کتنے غور سے ہماری طرف دیکھ رہی ہے۔" اس نے جھینپ کر اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں اور ننھی کو گود میں اٹھا لیا۔

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں بے جی، بابا اور بھائیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کیوں مجھے دھکا دے کر گھر سے نکالنے کو ہیں ابھی میرا ماسٹرز بھی کمپلیٹ نہیں ہوا اور انہوں نے تاریخ بھی طے کر دی اور وہ بھی کچھ دن بعد۔"

وہ ایک ہفتہ ہی لاہور رہ کر آئی تھی اور آتے ہی اسے علم ہوا تھا کہ فائقہ کی شادی ہو رہی ہے۔ نکاح اس کا پہلے سے ہو چکا تھا۔ شہریار اس کا تایا زاد کزن تھا۔ ساری فیملی امریکہ میں سیٹل تھی۔ فائقہ کو یقین تھا کہ یہ رخصتی کی کھچڑی بڑی دیر سے پک رہی تھی صرف وہی لاعلم تھی اور اب جبکہ پندرہ دن رہ گئے تھے اسے علم ہوا تھا ایسا کیوں کیا گیا تھا وہ جانتی نہیں تھی مگر اتنی جلدی مچانے پر اس نے بھی شور مچایا تھا جو سب نے سنا بھی تھا اور اسے نظر انداز بھی کر دیا تھا۔

"شہریار صاحب پچھلے ڈیڑھ مہینے سے یہیں موجود ہیں اپنے ابا اور اماں کے ساتھ۔ میں بھی کہوں تائی اماں کیوں بار بار فون کر کے میری پسند ناپسند جاننے کے درپے رہتی ہیں بے جی کی تیاریاں اف خدایا میں ہی پاگل تھی۔ کبھی کسی سے پوچھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔"

وہ پریشان تھی لیکن شہریار چونکہ اسے پسند تھا اس لیے پریشانی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی کہیں اندر کروٹیں لے رہی تھی۔

"ہاں بھلا ان جیسے امیر لوگوں کے لیے شادی کی تیاری بھلا کیا مسئلہ ہے۔"

اس نے اپنی ہی سوچ کی تائید کی۔

"اتنی کمینی سہیلی ملی ہے کہ حد نہیں۔ دلہن بنی ہوئی لڑکی خود اسے لینے آئی ہے اور ڈاکٹر صاحبہ کے مزاج ہی مل نہیں رہے۔"

اتنے دنوں سے وہ فائقہ کی طرف نہیں گئی تھی اس کی شادی کا کارڈ بہت دنوں سے اس کے نام آیا ہوا تھا مگر مصروفیت اتنی تھی کہ وہ ہسپتال سے گھر جاتی اور کھانا کھا کر سو جاتی۔ مہندی کی شام وہ خود اس کے سر پر موجود تھی۔ اس کو دھمو کا جڑتے اس نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے اس کے روپ کو دیکھا اور بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

"بس کرو اب یہ لولو پوچا اتنے دن سے کہاں تھیں تم اگر میں مصروف تھی تو تم نے کون سا پوچھ لیا کہ جیتی ہو کہ مر گئی۔" فائقہ کے بولتے کوئی دوسرا مشکل ہی سے بول پاتا تھا۔

"مریں تمہارے دشمن۔"

اس نے ایک بار پھر اسے ساتھ لگا لیا۔

"ایک وہ فرینہ ہے وہ بھی نہیں آرہی شادی میں اور رخ بارات پر ہی آئے گی۔ ان دونوں کو تو میں بعد میں دیکھوں گی۔ اور تم پانچ منٹ کے اندر تیار ہو کر آجاؤ ورنہ قتل کر دوں گی تمہیں۔ سمجھ گئیں نا میری بات۔"
اس نے دانت کچکچاتے ہاتھ اس کی گردن کی طرف بڑھائے۔
"اچھا بابا آرہی ہوں بس۔"
اس سے دوستی اور بات تھی عام دنوں میں اس کے ساتھ حویلی چلے جانا بھی اور بات تھی مگر شادی میں اکیلے شرکت کرنا جبکہ اس کا سارا خاندان اکٹھا ہو' اسے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا نہ اس کا کوئی خاندان تھا اور نہ ہی اس نے زیادہ شادیاں اٹینڈ کی تھیں مگر فائقہ کے اصرار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے پاس شادیوں پر پہننے کے کپڑے نہیں تھے اگر اسے اس کی شادی کے بارے میں علم ہوتا تو وہ گھر سے کپڑے لے آتی۔ بہر حال جانا تو تھا اس نے شاکنگ پنک ریڈی میڈ سوٹ جو اس کے خیال میں باقی سوٹوں سے قدرے شوخ تھا منتخب کیا اور پندرہ منٹ میں تیار ہو کے وہ صابرہ کے ساتھ حویلی جارہی تھی۔
"پتر تو بھی مہندی لگالے۔ یہی تو دن ہوتے ہیں کڑیوں کے سجنے کے۔ نہ سرمہ نہ کچھ اور۔"
فائقہ کی بے جی اسے دیکھ کر کٹورے میں گھولی مہندی اس کے پاس رکھ گئی تھیں۔ بے جی جو فائقہ کی دادی تھیں اسے ان پر رشک آتا اور فائقہ پر بھی جس کے ارد گرد اتنے محبت کرنے والے رشتے موجود تھے۔
"فائقہ یہ پراندہ ڈال کر چوٹی کر دو۔"
راحیلہ نے کٹے بالوں والا سر فائقہ کے سامنے جھکا دیا۔
"کہاں ڈالوں پراندہ' یہ دو بال بھی پراندے کے ساتھ نیچے آجائیں گے۔"
فائقہ کو تیار کرنے کی بجائے سب لڑکیوں کو اپنی تیاری کی پڑی تھی۔ دو بل دے کر اس نے کسی طرح پراندہ اس کے بالوں میں ڈال ہی دیا۔ گرتی پڑتی لڑکیوں کو تیار ہوتے دیکھ کر وہ انجوائے کرتی رہی۔ کتنا خوب صورت تھا یہ سب کچھ۔
"دفع ہو جاؤ تم لوگ یہاں سے مجھے بھی تیار ہونے دینا ہے یا نہیں۔"
فائقہ نے راحیلہ' ساجدہ' صبیحہ اور ثوبیہ کو دیکھا جو اپنی تیاریوں میں پوری طرح مگن ہر طرح سے غافل تھیں۔ جو کام اس کی گھوریوں' اور دھموکوں نے نہیں کیا تھا وہ ڈھول کی آواز نے کر دیا تھا۔ الٹے سیدھے سینڈل پہنتے وہ باہر جا چکی تھیں۔ اس نے ایک لمبا سانس لے کر خود کو بیڈ پر گرا دیا۔
فائقہ سیل فون کانوں سے لگائے فارینہ کے ساتھ لڑ رہی تھی۔ اس نے قریب پڑا مہندی کا کٹورا اپنے سامنے رکھ لیا اور — بال پن کے ساتھ الٹا سیدھا ڈیزائن بنانے لگی۔
"مہندی لگانے کا اتنا شوق ہے تو لائیں میں لگا دوں۔ آپ سے تو یقیناً" بہت اچھی لگاؤں گا۔"
اس نے تیزی سے سر اٹھایا تیمور اس کے سر پر کھڑا تنقیدی نظروں سے اس کے ہاتھ کو گھور رہا تھا۔ زیرِ لب مسکراہٹ گہری ہو رہی تھی۔
"ویسے کیا مہندی کے ڈیزائن میں کیچوے بنانے کا فیشن ہے آج کل۔"
اس کے سنجیدگی سے سوال کرنے پر غور سے اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا واقعی ڈیزائن کی بجائے کیچوے جیسا ڈیزائن اس کے سامنے تھا۔ اس نے ہاتھ جلدی سے پیچھے چھپا لیے جیسے وہ پکڑ کر واقعی ڈیزائن بنانے والا ہو۔
"تیمور بھائی کل آپ کو میری دو فرینڈز کو بس اڈے سے گھر لانا ہے ان کے پاس کنوینس نہیں ہے اور انہیں حویلی کا بھی پتا نہیں ہے۔"
سیل آف کر کے وہ تیمور کے پاس آگئی۔
"کیوں کل مجھے اور کام کم ہیں جو آپ کا اور آپ کی سہیلیوں کا ڈرائیور بھی بن جاؤں۔"
اسے چھیڑنے کو اس نے کہا تھا اور وہ واقعی منہ پھلا کر بیٹھ گئی تھی۔
"ایک تو مذاق بھی آپ کو بتا کر کرنا چاہیے کہ آنسہ فائقہ خاتون میں مذاق کر رہا ہوں آپ برا مت مانیے گا۔"

اس نے اسے اتنے خوش گوار موڈ میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بھائی بہن کی نوک جھوک وہ مزے سے سن رہی تھی۔ وہ دس منٹ سے ادھر تھا اور مسلسل اسے حیران کر رہا تھا۔ آج وہ شلوار قمیص کی بجائے پینٹ شرٹ میں تھا۔
"ویسے بھیا آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں آپ تو واقعی کل بہت مصروف ہوں گے میں ضیاء سے کہہ دیتی ہوں۔"
چونکہ سارا انتظام اسی کے سر تھا اس لیے فائقہ نے اس کام کے لیے ضیاء کو منتخب کیا تھا۔ ان دونوں کو مصروفِ گفتگو دیکھ کر اس نے پاس پڑے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کر لیا۔
"مراقبے سے باہر آجاؤ بھیا جا چکے ہیں اور پلیز اماں کبری سے ایک کپ چائے کا لے آؤ اس فرینہ کی بچی نے سر پلپلا کر دیا ہے۔"
فائقہ نے سر ہاتھوں سے دباتے دہائی دی۔ طویل راہداری سنسان تھی۔ باہر بجتے ڈھول کا شور اور مختلف آوازیں یہاں بھی آرہی تھیں مگر باہر کی نسبت قدرے خاموش فضا۔
راہداری کے آخر میں صحن اور صحن کے دائیں طرف بڑا سا کچن۔ وہ کئی بار پہلے بھی یہاں آچکی تھی ذہن میں حویلی کا نقشہ ذہن میں لاتے اس نے قدم آگے بڑھائے۔ تھوڑی دیر پہلے کی نوک جھوک بڑا خوشگوار سا تاثر چھوڑ گئی تھی۔ راہداری کے آخری سرے پر پہنچتے ہی لائٹ چلی گئی۔
"اسے بھی ابھی جانا تھا۔"
جھنجلاتے ہوئے اس نے زیرِ لب کہا۔ گھپ اندھیرے میں اس نے قدم آگے بڑھایا کہ دو بازوؤں نے اسے جکڑ لیا۔
"کون ہے چھوڑو مجھے۔"
کچھ سیکنڈز کے لیے تو اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور سمجھ آنے پر اس نے پوری قوت لگا کر اس

وہ خبطی سی دیوانی سی
ایک خبطی سی لڑکی کی کہانی
آسیہ سلیم قریشی
کا ایک ایسا ناول جو
خواتین ڈائجسٹ
میں قسط وار چھپا اور بے حد
مقبول ہوا' آج بھی ہر لڑکی' ہر
خاتون یہ ناول پڑھنا چاہتی ہے'
اب کتابی صورت میں چھپ گیا ہے
مجلد، خوبصورت سرورق، قیمت 400 روپے
خواتین ڈائجسٹ
اردو بازار کراچی
ملنے کا پتا
• مکتبہ عمران ڈائجسٹ اردو بازار کراچی
• لاہور اکیڈمی، 205 سرکلر روڈ
بیرون اردو بازار، لاہور

شکنجے سے باہر نکالنا چاہا تھا۔ چیخنے کے لیے منہ کھولا کہ ایک ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جم گیا۔ اس کی طرف سے مزاحمت جاری تھی۔ جس تیزی اور مضبوطی سے اسے جکڑا گیا تھا اسی تیزی سے اسے چھوڑ کر وہ نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔

وہ ہق دق سی وہیں کھڑی تھی کہ لائٹ آ گئی اور لائٹ کے ساتھ ہی لڑکیوں کی شرارتی ٹولی اسے اپنے پاس دکھائی دی۔

"سلویٰ کیا ہوا۔"

صبیحہ اس کے فق چہرے کو دیکھ کر اس کے پاس آ گئی۔

وہ بے دھیانی میں اس کی طرف دیکھتی رہی اور دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی۔"

اب کے ساجدہ بھی اس کے قریب آ گئی۔ اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور پیر گھسیٹتی فائقہ کے کمرے میں آ گئی۔ عجب تذلیل کا احساس تھا جس نے اسے سن کر دیا تھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں گھر جا رہی ہوں صابرہ کو بلوا دو۔"

فائقہ کے بہت پوچھنے اور روکنے پر وہ رکی نہیں تھی۔ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ کیا سوچ رہی ہو گی۔ اس کی ناراضگی کی بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ سکتے کی کیفیت میں چلتی وہ گھر تک آئی تھی اور آتے ہی اشکوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

"کیا وہ اتنی ہی ارزاں ہے کہ جس کا۔"

خوں رنگ آنکھیں پونچھتے خیال خود ہی اس گھٹیا شخص کی جانب مڑ گیا تھا۔

"کون تھا وہ اس پر شب خون مارنے والا گھٹیا شخص، حویلیوں کے زنان خانے میں کسی عام شخص کو تو آنے کی اجازت نہیں ہوتی انتہائی قریبی شخصیات۔"

اور ذہن میں قریبی شخصیات آتے ہی سب سے پہلے اسی کا خیال آیا تھا۔

تیمور، ہاں وہی تو تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے تک اندر بلکہ اس کے نکلنے سے ایک منٹ پہلے ہی تو نکلا تھا۔

کمینہ ذلیل، بدکردار بہن کی سہیلی کو بھی نہیں چھوڑا ذلیل جنگلی۔

اس کا دل چاہا اس کا چہرہ نوچ ڈالے غصے اور اذیت کی کھولن اسے سکون نہ لینے دے رہی تھی۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ لائٹ آنے پر وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی سب کو بتا دینا چاہتی تھی اور اس کمینہ شخص کا چہرہ بے نقاب دیکھنا چاہتی تھی مگر ایسے میں تماشا خود اس کی اپنی ذات کا لگنے والا تھا ذلت و رسوائی اسی کا مقدر ٹھہرتی۔

اس وقت اسے امی، بابا اور مزنہ کتنا یاد آئے تھے۔

روتے روتے اس نے پیشانی کھڑکی سے ٹکا دی مگر اس کا ذہن ابھی تک اس بو کا سراغ نہ لگا پایا تھا جو ان ہاتھوں سے آ رہی تھی۔ جو تھوڑی دیر کے لیے اس کے منہ پر جمے رہے تھے۔

اور پھر فائقہ کے بلاوے، دھمکیاں، ڈراوے بھی اسے ٹس سے مس نہ کر سکے تھے۔ اس نے حویلی نہ جانے کی قسم کھائی تھی اور وہ اس قسم پر ہمیشہ قائم رہنے والی تھی۔

"اگر حشمت چاچا نے اسے بھیجا ہے تو حشمت چاچا اس شخص کے کردار کے بارے میں نہیں جانتے۔"

اسے اپنے ارد گرد ہر چیز سے نفرت ہو رہی تھی۔

(دوسرا اور آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

صائمہ اقبال

اسی سے عبارت رنگ و بو

"بھا جی مجھے تو لگتا تھا آپ بھی بھول گئے ہیں مجھے"، توفیق، عتیق بھیا کو اپنے صحن میں اپنے سامنے دیکھ کر جذباتی ہو گیا تھا ان کے چوڑے سینے سے لگے بہت ٹھنڈک اور سکون ملا تھا اسے وہ بھی کتنی دیر اسے لپٹائے کھڑے رہے۔

"او نہیں یار تجھے کیسے بھول سکتا ہوں، ہاں

۲

دوسرا اور آخری حصہ

ناولٹ

مصروفیت اور کام کچھ زیادہ تھا۔ انیس بھائی ساری فیملی کے ساتھ باہر چلے گئے ہیں اور۔" اب وہ اسے کیا بتاتے کہ بابا کی وجہ سے وہ اس کی طرف نہیں آپائے تھے۔ بابا نے واضح لفظوں میں انہیں دھمکی دی تھی۔

"اس سے ملنا ہے تو مجھے چھوڑنا پڑے گا۔ جہاں ایک کی دوری مجھ پر کوئی اثر نہیں کر سکتی دوسرا بھی جاتا ہے تو چلا جائے۔"

اور وہ صرف بے جی کا پژمردہ چہرہ دیکھ کر رہ گئے تھے نہ اس کی صفائی پیش کی تھی نہ ہی کچھ اور اب بھی وہ اس کے دوست حشمت سے اس کے نئے گھر کا پتا لے کر اس تک آئے تھے۔

"انیس بھائی بھابھی اور بے جی ٹھیک ہیں۔" ان کے بیٹھتے ہی اس نے بے صبری سے پوچھا ہاں وہ انہیں چھوڑ آیا تھا پر اتنے سال گزرنے کے باوجود دل ابھی بھی ادھر کھنچتا تھا۔ بے جی کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئی تھیں پر بے جی کی آزمائش سخت تھی۔

"جس دن تو اس سے ملی سمجھنا میری طرف سے فارغ ہے اس دن تو۔"

بابا کا جملہ عتیق کے ذریعے اس تک پہنچا تھا۔ بے جی اس عمر میں رسوائی کا داغ لگانے کی بجائے عزیز ترین بیٹے کی دوری "مجبوراً" اور "قصداً" سہہ رہی تھیں۔

"چاچو، آپ ٹھیک تو ہیں نا۔"

دس سالہ عادل چاچو کا چہیتا تھا۔ توفیق کی توجہ اپنی طرف نہ پا کر وہ خود ہی اس کی جانب بڑھا۔

"میرا شیر بھی آیا ہے اور مجھے دیکھو ابھی تک اپنی باتوں ہی میں لگا ہوا ہوں۔"

توفیق نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"میری جان میں بالکل ٹھیک ہوں آپ سنائیں امی بھیا اور آپ کا کیا حال ہے۔"

اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ ابھی تک یہی مسئلہ حل نہیں کر پا رہا تھا کہ اس کے اتنے نفاست پسند اور برانڈڈ چیزیں لینے والے چاچو اس دو کمروں کے چھوٹے گھر میں عام سے کپڑے پہنے بھلا کر کیا رہے ہیں۔ اس نے بہت بار بابا سے پوچھا تھا مگر وہ کوئی جواب ہی دے نہیں پاتے تھے۔ اسے یہ تو پتا تھا کہ چاچو کا بڑے ابا کے ساتھ جھگڑا ہوا ہے مگر جھگڑا اتنا طوالت اختیار کر جائے گا اسے علم نہ تھا۔ پہلے اس نے

بہت بار چاچو سے ملنے کی ضد بھی کی تھی مگر بابا اسے نہیں لائے تھے اور آج اسے خود ہی تیار ہونے کو کہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ کسی کو بتانا نہیں ہے۔ ان سے ملنے کی خوشی اس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔ ان کے آنے پر فہمی کمرے میں محصور ہو کر رہ جاتی تھی یہ نہیں تھا کہ ان کا رویہ اس کے ساتھ برا تھا مگر ان کے آنے پر اس کی شرمندگی حد سے زیادہ ہو جاتی تھی ایک ایک کر کے اسے وہ گناہ یاد آنے لگتے جو اس کے باپ نے کیے تھے اور قصور وار وہ ٹھہرائی گئی تھی۔ ہاں اس کے باپ نے جوان ہوتے بچوں کے سامنے وہ کیا تھا جو کوئی بھی غیرت مند شخص مر کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

پانچ سالہ سلویٰ اور دو سالہ مزنہ کو نووارد اجنبی کے ساتھ اپنے رشتے کا کچھ پتا نہیں تھا مگر محبت ہر رشتے پر حاوی ہو جاتی ہے اور عتیق بھائی نے دونوں کو اتنا پیار کیا تھا کہ وہ دو گھنٹوں سے انہی کے پاس موجود تھیں۔ ننھی مزنی کو اٹھائے عادل سلویٰ کو کہانیاں سنا رہا تھا۔ پھولے پھولے سرخ گالوں والی دونوں لڑکیاں اس کے عزیز از جان چاچو کی بیٹیاں تھیں اسے ان پر کتنا پیار آیا تھا۔

"وہی ڈھاک کے تین پات لگتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ان کا غصہ اور نفرت بھی شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ ہماری نئی نسلیں اپنے پیارے رشتوں کی پہچان نہیں رکھتیں۔ آخر ایسا کب تک چلے گا۔ میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں۔ کوئی بھی چیز اپنی اصل سے جدا ہو کر اپنی حیثیت اور شناخت برقرار نہیں رکھ سکتی۔ قطرہ' دریا کے بغیر کچھ نہیں' بانسری سے نکلنے والی پر سوز صدا دراصل درخت سے جدا ہونے کی بدولت ہوتی ہے اور ہم بھی خاندان' رشتوں کے بغیر کچھ نہیں۔"

وہ پہلے بھی کئی بار آ چکے تھے لیکن آج ان کا ارادہ اٹھنے کا نہیں لگتا تھا انہوں نے کھانا فرمائش کر کے بنوایا تھا۔ شام کے وقت وہ ٹیوشن کے لیے بھی نہیں گیا تھا۔ شام کے فارغ وقت میں وہ دو گھروں میں بچوں کو میتھس کی ٹیوشن دیتا تھا۔ ان کی باتوں سے اسے سو فیصدی اتفاق تھا۔ اس کے بچے تھے گھر تھا محبت کرنے والی بیوی تھی مگر پھر بھی کہیں کچھ کمی تھی۔ وہ سخت محنت کرتا تو گھر چل پاتا تھا مگر اسے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اتنی بڑی جاگیر میں اس کا بھی حصہ تھا مگر رشتوں سے دوری اس کے لیے بھی سوہان روح تھی وہ بردبار سے عتیق بھائی کی طرف دیکھتا رہا جو سامنے بیٹھے عادل' سلویٰ اور مزنہ کو دیکھے جا رہے تھے۔

"پتا نہیں تم میری بات کو پسند کرو گے یا نہیں لیکن بہت سوچ بچار کے بعد ہی میں یہ بات تم سے کہہ رہا ہوں۔"

انہوں نے کچھ دیر توقف کیا اور چھوٹے بھائی کو دیکھنے لگے۔ جو پوری طرح انہی کی طرف متوجہ تھا۔

"بھیا آپ کیا کہہ رہے ہیں بھلا آپ کی بات میں کس طرح ناپسند کر سکتا ہوں۔"

دوسری چارپائی سے اٹھ کر وہ ان کے پاس بیٹھ گیا ان کا ہاتھ تھامتے اس کی آنکھوں میں جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔

"میں آج عادل کو اسی لیے ساتھ لایا ہوں۔ سلویٰ اور عادل کا جوڑ بنتا ہے۔ ان دونوں کا رشتہ ہی اس خاندان کو ایک کرنے کی صورت ہے۔ عادل تم سے بہت انسیت رکھتا ہے تم جیسا بننا چاہتا ہے اور بابا اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان دونوں کا نکاح ہی واحد حل نظر آتا ہے۔"

انہوں نے صحیح معنوں میں اسے سوچوں کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔

"لیکن بھیا اگر بابا مجھے یعنی اپنے بیٹے کو رشتہ توڑنے پر مجبور کر سکتے ہیں تو کیا عادل کو...... اور پھر اس طرح کے فیصلے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا اس بات کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔ لیکن میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا صرف ایک بات کی ہے میں نے۔"

عتیق ملک اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔

"تم پر میری طرف سے کوئی دباؤ نہیں اچھی طرح سوچ لو۔ تمہارا جو بھی فیصلہ ہو گا سر آنکھوں پر ہو گا اور

کبھی نہ سمجھنا کہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔ اگر تمہارا فیصلہ نفی میں بھی ہو تب بھی تم میرے لیے اتنے ہی اہم اور پیارے رہو گے۔ عادل ادھر لاؤ ننھی گڑیا کو میں بھی تو اسے اٹھا کر دیکھوں۔" دور بیٹھے عادل کو آواز دے کر انہوں نے مزنہ کو اٹھا لیا اور اس سے توتلی زبان میں باتیں کرنے لگے۔

ساری رات سوچنے اور فہمی سے مشورے کے بعد صبح اس نے ان کے فیصلے کو دل و جان سے قبول کر لیا تھا۔ وہ ان کی کسی بات سے اختلاف کر ہی نہیں سکتا تھا۔ حشمت بھی اس موقع پر موجود تھا اسے اس کے فیصلے پر بہت حیرت ہوئی تھی مگر وہ چپ رہا تھا۔ عتیق بھیا نکاح کے کئی گھنٹے بعد تک بھی موجود رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

اسے رہ رہ کر دکھ نہ جانے کس بات کا ہو رہا تھا۔ وہ اسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا کوئی دلی تعلق بھی نہیں تھا۔ محبت بھی نہیں تھی لیکن اسے اس سے کم از کم اس حرکت کی توقع بالکل نہیں تھی وہ رعب سے بولتا تھا اس کے لب و لہجے میں گھن گرج تھی لیکن وہ اسے گھٹیا یا برے کردار کا کبھی نہیں لگا تھا۔ اس کی نظروں میں کبھی برائی کا عکس بھی نظر نہیں آیا تھا۔ ایک دکھ تو اپنی تذلیل کا تھا جو اسے رلا رہا تھا اور دوسرا دکھ اسے اپنی توقع اور امید کے غلط ثابت ہونے کا تھا۔

"اس نے ایسا کیوں کیا۔"

"وہ ایسا نہیں ہے پھر۔"

"لیکن وہ اسے کتنا جانتی تھی؟"

"صرف دیکھنے کی حد تک۔" انسان ایک معمہ ہے یہ اس کی اپنی رائے تھی جسے وہ بہت مرتبہ اپنی سہیلیوں کے سامنے بیان کر چکی تھی۔

اپنی ہی رائے کو سچ ثابت ہوتے دیکھنا اس کے لیے تکلیف دہ عمل تھا۔

"کیا وہ اپنے لیے رو رہی ہے یا اس کے لیے۔"

سوال کا جواب مشکل سہی پر مل گیا تھا اس کی اپنی ذات اس کے لیے اہم تھی اور اپنی خودی اس سے بھی بڑھ کر۔

"حشمت چاچا مجھے نہیں کرنی یہاں جاب میں واپس آ رہی ہوں بس ابھی اسی وقت۔"

رات نہ جانے کس وقت آنکھ لگی تھی اور جاگتے ہی وہ منظر تازہ ہو گیا تھا۔ حشمت چاچا کو فون کرتے وہ بہت سنجیدہ تھی۔ سلام دعا کے بغیر ہی وہ شروع ہو چکی تھی۔

"بے وقوفی مت کرو سلویٰ! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ دو سال کا کنٹریکٹ کیا ہے تم نے اسے کیسے چھوڑ کر آ سکتی ہو تم۔"

اس کی طبیعت میں بچپنا تھا اور لاپروائی بھی۔ انہوں نے اسے بھی اس کی بچکانہ طبیعت کا انداز سمجھا تھا آواز میں نرمی اور ڈانٹ کا تاثر موجود تھا۔ مزید کوئی بات کیے بغیر اس نے سیل پلنگ پر پٹخ دیا۔

"اپنی بیٹی ہوتی تو پوچھتی اور دیکھتی کہ کیسے اس طرح۔"

سوچوں میں بھی تلخی گھل گئی تھی۔

"باپ اور بھائی کا مضبوط سائبان نہ ہو تو مجھ جیسی لڑکیاں ایسے ہی ٹھوکریں کھاتی ہیں۔" اس کی سوچیں زہر میں بجھے تیروں کی طرح خود بھی اسے تکلیف دے رہی تھیں۔

"لعنت ہو تم پر تیمور ملک۔ دیکھ لوں گی میں تمہیں۔"

ایک نئے عزم کے ساتھ وہ ہسپتال جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ اور پھر کئی ہفتے اسی طرح گزر گئے تھے۔ فائقہ بھی اس سے ملنے نہیں آئی تھی۔

"دو عورتیں آپ سے اکیلے میں ملنا چاہتی ہیں۔ دوپہر سے بیٹھی ہیں اور یہ وقت ہو گیا ہے۔ کئی بار میں نے انہیں آپ کے پاس بھیجنا چاہا پر وہ کہتی ہیں کہ جب سب مریض چلے جائیں تب بات کریں گی۔ آپ کہیں تو انہیں بھیج دوں آپ کے پاس۔"

سکینہ اسے بتا کر کھڑی رہی۔ سلویٰ اس علاقے میں کسی کو نہیں جانتی تھی نہ ہی کسی سے واقفیت تھی۔

اگر وہ دونوں مریض نہیں تھیں تو کس سلسلے میں اس سے ملنا چاہتی تھیں۔

"کہاں سے آئی ہیں؟" پر سوچ انداز میں وہ اس سے پوچھنے لگی۔

"یہ تو مجھے پتا نہیں۔"

"اچھا بلاؤ ان کو جانے سے پہلے سن لوں کہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

اسے کہہ کر اس نے چیزیں سمیٹنی شروع کر دیں جو اسے ساتھ لے کر جانی تھیں۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔" ان کے سلام کرنے پر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ادھیڑ عمر اور جوان دونوں نقاب میں تھیں ۔ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ مگر ان کے خاموش رہنے پر اسے خود ہی پوچھنا پڑا تھا۔

"جی میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔"

"یہ میری بیٹی ہے تبسم اسے چیک کروانا تھا۔"

عورت کا رویّہ نہ جانے کیوں اسے پر اسرار سا محسوس ہوا تھا۔ ابھی تک انہوں نے نقاب بھی نہیں اتارے تھے۔ کپڑوں اور حلیے سے وہ کسی اچھے گھرانے کی دکھائی دے رہی تھیں۔

"اگر انہیں چیک اپ ہی کروانا تھا تو اتنی دیر بیٹھے رہنے اور پھر اکیلے ملنے پر اتنا اصرار کیوں تھا۔ اپنی باری پر بھی وہ دونوں اندر آسکتی تھیں۔"

الجھن زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھتے اس نے سر جھٹک دیا۔

"شاید وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو اسپیشل پروٹوکول چاہتے ہیں۔"

"جی بی بی آپ ادھر آجائیے۔"

پیشہ وارانہ انداز میں اس نے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن اس کے بلانے پر بھی تبسم ٹس سے مس نہ ہوئی تھی بلکہ اس کی ماں اٹھ کر سلوی کے نزدیک آگئی۔

"ڈاکٹر صاحبہ ہم ساتھ والے پنڈ سے آئے ہیں چودھرانی ہوں میں پنڈ کی۔"

عجیب سرگوشیوں میں بات کر رہی تھی وہ عورت۔ بہر حال اسے اس کی بات سننی تھی۔

"ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی صرف سولہ درھے۔ بے وقوف جھلی ہے بالکل اسے تو ابھی ان باتوں کا اتنا پتا بھی نہیں ہے۔ اس کے باپ یا بھائیوں کو پتا چل گیا تو اس کے ٹوٹے کر دیں گے۔ وہ اس کے چاچے کا پتر ہے پسند کرتے ہیں دونوں ایک دوسرے کو۔ لیکن آپس میں بول چال نہیں ہے اس لیے۔ اس نے خفیہ نکاح کر لیا ہے اس کے ساتھ اور اب ..... بس آپ اسے اس سے نجات دلا دیں کسی بھی طرح۔ پیسوں کی فکر نہ کریں آپ بس کوئی ایسی دوا دیں ....."

عورت کا انداز رازدارانہ اور سرگوشیانہ تھا وہ اس کی باتیں غور سے سنتی رہی تھی مگر آخری بات پر وہ ایسے کھڑی ہو گئی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ سرخ چہرے کے ساتھ وہ اسے دیکھتی رہی۔

"اس سے پہلے کہ میں دھکے دے کر آپ کو باہر نکال دوں آپ چلی جائیں یہاں سے۔"

غصے اور تاسف سے اس کی آواز لرزنے لگی۔

"کیا سمجھ کر آپ یہاں آئی ہیں۔ ضمیر فروش یا پیسے کی پیر بہت پیسہ ہو گا آپ کے پاس لیکن میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ جا سکتی ہیں اب۔"

اس نے خارجی دروازے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"تم ہمیں جانتی نہیں ہو۔ پورا گاؤں۔" عورت کی آواز یک بیک ہی بلند ہو گئی۔

"پہلے نہیں جانتی تھی اب اچھی طرح جان گئی ہوں اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اسے اس کے شوہر کے ساتھ رخصت کر دیں"

اس کا انداز اتنا قطعی تھا کہ عورت کچھ دیر خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک جھٹکے سے بیٹی کو کھینچتی ہوئی باہر چلی گئی۔

"رمضان، رمضان۔"

رمضان تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی آواز بہت تیز ہو گئی تھی۔ جس کا اسے جلد ہی احساس ہو گیا۔

"کوئی اور مریض ہے تو بھیج دو۔"

اب کے آواز ہلکی تھی۔ اس کے سر نفی میں ہلانے پر اس نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور خود اس عجیب و غریب عورت اور اس کی سنائی داستان اور آخر میں دھمکی دینے والے انداز پر غور کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

لارنس کالج گھوڑا گلی آنے سے پہلے دو تین بار وہ بابا کے ساتھ چاچو کے گھر گیا تھا۔ وہ ابھی بہت چھوٹی تھی لیکن خود اسے کچھ کچھ اس رشتے کا احساس ہونے لگا تھا اور پھر پاپا بھی اسے چاچو اور اس رشتے کے حوالے سے کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے تھے نتیجہ یہ ہوا تھا کہ چاچو کی طرح وہ بھی اپنی حیثیت منواتی چلی گئی تھی۔ پاپا گاہے بہ گاہے اس کی تصویریں بھی اسے بھیجتے رہتے تھے وہ بہت خوب صورت تھی اگر نہ بھی ہوتی تو اسے عزیز ہوتی۔ امی پاپا کی کار کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور وہ دونوں ان بہن بھائیوں کو اکیلا چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔ اسے یقین نہ آتا۔ چاچو کو لینے وہ خود گیا تھا مگر اس گھر میں لگا تالا دیکھ کر اس کے حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے پاپا کی ناگہانی موت اور چچا کا بغیر بتائے کسی دوسری جگہ چلے جانا جبکہ وہ کسی دوسرے ٹھکانے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ناکام اور مایوس واپس لوٹتے وہ کتنا اداس تھا مگر کسی کو بتانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ دادا کی ساری عمر کی مخالفت اپنی جگہ پر وہ دونوں بھائیوں کی محبت کو جانتے تھے وہ دادا کی ناراضگی کے باوجود انہیں ملانا چاہتا تھا۔

بابا کے بعد انہیں تلاش کرتے وہ تھک گیا تھا۔ حشمت عثمانی ہارٹ اسپشلائزیشن کے لیے امریکہ جا چکے تھے اور ان کی فیملی ہسپتال کی طرف سے کہیں اور منتقل ہو چکی تھی۔ وہ انہیں تلاش کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ بابا کو بتانا بھی تو کیا۔ بابا کے شدید اصرار پر اسے اعلا تعلیم کے لیے آکسفورڈ آنا پڑا تھا۔ پاکستان میں رہنے کا جواز اس کے پاس نہیں تھا اور تعلیم خاص طور پر اعلا تعلیم اس کا بھی خواب تھا لیکن یہاں بھی بے سکونی اور بے قراری تھی جو اسے بے کل رکھتی۔

"کیا پاپا کے ساتھ کیا وعدہ کبھی ایفا ہونے والا نہیں تھا کیا وہ انہیں تلاش کر پائے گا؟" ایسے سوالات تھے جو گاہے بہ گاہے اپنی اہمیت جتاتے رہتے تھے۔ "چچی، مزنہ اور سلوی، کیا چچا خود ہی کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔"

جو بھی تھا اسے پڑھائی کی طرف توجہ دینی تھی۔ بہت بار پہلے کی طرح وہ حشمت عثمانی کے ہاسپٹل کے سامنے موجود تھا۔

"شاید وہ واپس آگئے ہوں یا ان کا کچھ پتا چلا ہو۔"

وہ شاید قبولیت کی گھڑی تھی حشمت عثمانی تو مل گئے تھے لیکن چاچو توفیق ہمیشہ کے لیے کھو گئے تھے۔ توفیق کا انتقال کچھ سال پہلے ہوا تھا جب حشمت بھی پاکستان میں موجود نہیں تھے تیمور عادل نے ہسپتال صرف اس کے لیے بنوایا تھا۔ حشمت انکل کا کہنا تھا کہ وہ اس رشتے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی اسے بابا کو کنوینس کرنا تھا ان تینوں کو یہاں لانا تھا لیکن یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔ جو شخص ساری عمر اپنے بیٹے کو دیکھنے کا روادار نہ ہوا تھا اب بیٹے کی اولاد بھلا اس کے لیے کیا اہمیت رکھتی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ وہ ضرور کامیاب ہو گا۔

کہتے ہیں کہ اولاد کی اولاد زیادہ پیاری ہوتی ہے اسے بھی یقین تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اولاد کی اولاد سے منہ نہ موڑ سکیں گے ۔ بے جی کی تسبیحات ساری کی ساری توفیق چودھری کے لیے تھیں جو منوں مٹی کے نیچے تھے۔ ان کے لب ہر دم ان کے لیے دعاگو رہتے تھے۔

وہ اسی وقت ان سے ملنا چاہتا تھا مگر حشمت انکل نے اسے منع کر دیا تھا اور حشمت انکل کی کوئی بات وہ ٹال نہیں سکتا تھا ہاں بچھڑے ہوؤں کو ملانے کے پہلے

مرحلے کا کام اس نے شروع کر دیا تھا۔ یعنی اسے گاؤں کے ہسپتال لانا اور حشمت عثمانی اس کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"چائے لاؤں میڈم آپ کے لیے۔"

کھانا کھانے کے بعد سکینہ اسے پوچھنے کے لیے آئی تھی۔ آج صبح ہی سے مریضوں کا زیادہ رش نہیں تھا زیادہ وقت فارغ بیٹھے بیٹھے ہی گزرا تھا شاید فارغ بیٹھنے سے ہی سر کا درد شدت اختیار کر گیا تھا۔ وہ چائے نہیں پیتی تھی لیکن آج اس کا دل اور دماغ دونوں چائے کی حمایت کرنے لگے۔

"ہاں لے آؤ۔ اپنی چائے بھی یہیں لے آنا۔"

سکینہ کو چائے لانے کا کہہ کر وہ چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

"سکینہ چائے میں چینی نہ ڈالنا۔"

اس نے کمرے میں قدم رکھتے سکینہ کو پکارا اور ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔ ضیاء ملک میز کی دوسری طرف کرسی پر براجمان تھا۔ اس اول جلول حلیے والے شخص کو یہاں دیکھ کر ایک دم ہی وہ کوفت کا شکار ہو گئی بلکہ شاید حویلی کا کوئی بھی فرد ہوتا وہ اسی کوفت اور بے زاری کا شکار ہو جاتی وہ ان کی شکلیں بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

"السلام علیکم۔" اسے کمرے میں آتے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"پلیز تشریف رکھیے۔" آنکھیں ماتھے پر رکھ لینا اس کی عادت نہیں تھی۔ بہ حالت مجبوری سہی اسے برداشت کرنا تھا وہ چل کر یہاں آیا تھا۔

"بے جی کئی دنوں سے آپ کو یاد کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ مجھے انہوں نے ہی بھیجا ہے آپ کی طرف۔ فائقہ کی شادی میں بھی شریک نہیں ہوئیں آپ۔ وہ بھی ناراض تھی کافی زیادہ، بہرحال اب تو وہ جا چکی ہے۔ ہاں ناراضگی کا اظہار ضرور کر گئی ہے۔"

اس کا لہجہ شگفتہ اور مہذب تھا۔ اپنے حلیے کے برعکس اس کی باتوں سے شائستگی ٹپک رہی تھی۔ مگر فائقہ کی شادی کا تذکرہ از سر نو اسے آگ کی لپٹوں میں دھکیل گیا تھا۔ خود کو بہت سمجھا بجھا کر اس نے اپنے آپ کو یہاں رہنے پر مجبور کیا تھا۔ دوسری طرف یہاں کے غریب لوگوں سے بھی اسے انسیت ہو گئی تھی مگر اس ایک واقعے کو سوچ کر اس کا دماغ کھولنے لگتا۔

"سکینہ ملک صاحب کو چائے دو۔ میں تھوڑی دیر کے لیے گھر جا رہی ہوں۔"

دروازے سے اندر آتی سکینہ کو دیکھ کر اس نے بیگ اٹھایا اور قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔ نفرت اور بے زاری کا اظہار اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس کی کسی بات کا جواب دینا اس نے گوارا نہیں کیا تھا اسے وہیں ہکا بکا چھوڑ کر وہ باہر نکل آئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن اسے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ اسے گھر نہیں جانا تھا نہ ہی کوئی کام تھا مگر گھر کے راستے پر چلتے وہ کافی مطمئن سی تھی۔ بلیک کرولا دھول اڑاتی تیزی سے اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ اس نے اس شخص کو کافی سے زیادہ بے عزت کر دیا تھا۔ دھول بیٹھی تو کرولا نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ گھر کی بجائے اس کا رخ پھر ہسپتال کی جانب تھا۔

سکینہ اسے چار منٹ بعد پھر وہیں دیکھ کر بہت حیران رہ گئی تھی۔ چائے کا کپ ابھی ویسے ہی دھرا تھا۔ اسے اٹھا کر اس نے چسکی لی۔ چینی کی مقدار کافی زیادہ تھی مگر اسے بری نہیں لگی تھی۔

"کاش اس کی جگہ وہ ہوتا۔"

دل میں سوچتے اس نے سر جھٹکا۔

"یہ سب اسی قابل ہیں کہ انہیں منہ نہ لگایا جائے نہ جانے خود کو کیا سمجھتے ہیں اونہہ۔"

☼ ☼ ☼

سلویٰ کی آنکھیں خوف اور آنے والے وقت کی دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ دیوار کے ساتھ سمٹتے

بیٹھتی چلی گئی۔ چہرے کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ پچھلے پانچ گھنٹوں سے ہونے والے واقعات اس کی سمجھ سے بالاتر تھے اسے ابھی تک اس حقیقت پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ بند کمرے میں محبوس تھی۔ دروازہ باہر سے بند تھا اس کے باوجود اسے لگ رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے یا کوئی خوف ناک فلم۔ دل کی دھڑکن کبھی رک رک کر چلنے لگتی اور کبھی اس کی رفتار انتہائی تیز ہو جاتی۔ چیخ چیخ کر رونے اور دروازہ پیٹنے کا بھی کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا شاید اس بڑے گھر میں کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ وہ زندگی میں کبھی اتنی خوف زدہ نہیں ہوئی تھی جتنی اب تھی چیخ چیخ کر رونے سے گلا بھی بیٹھ چکا تھا اس کوٹھری نما کمرے میں کہیں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔

"اگر میری بہن کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں دیکھ لوں گا ساری ڈاکٹری باہر نہ نکال دی تو نام بدل دینا میرا۔"

رعونت بھرے انداز میں کہتا وہ شخص ایک بار پھر اس کے سامنے آ گیا۔ سوچ کر ہی اسے جھرجھری آ گئی۔ اسے یہاں سے چھڑانے والا کون تھا۔ ماں اور بہن یہاں سے کئی گھنٹوں کی مسافت پر تھیں۔

"کیا ہونے والا ہے؟"

پانچ گھنٹوں سے یہی ایک سوال اس کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔ کئی گھنٹے پہلے کے واقعات ذہن کی اسکرین پر فلم کی طرح چلنے لگے۔

"بی بی جی ایک بندہ اور زنانی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے بڑا کہا ہے کہ آپ ابھی آئی ہیں پر وہ ابھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

وہ ابھی ہسپتال سے گھر آئی تھی صابرہ اور راشد اس کے قریب بیٹھے تھے صبح سے ہونے والی ہلکی بارش نے کافی ٹھنڈ کر دی تھی۔ کبھی کبھار کچھ لوگ گھر بھی دوا کے لیے آ جایا کرتے تھے اس نے کبھی انہیں منع نہیں کیا تھا۔ چپل پہن کر وہ باہر نکل آئی۔

"وہ جی میری دھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ چل کر اسے دیکھ لیں۔"

ادھیڑ عمر مرد ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ عورت کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"آپ اسے یہیں لے آتے میں دیکھ لیتی کیا ہوا ہے اسے؟"

ان کی حالت اور کسمپرسی دیکھ کر اس کا دل اور نرم ہو گیا تھا۔

"وہ تو جی پہلے ہی ادھ موئی پڑی ہوئی ہے تانگے پر لگنے والے جھٹکے اسے ادھے راہ میں ہی مار ڈالتے۔"

اب کی بار عورت نے روتے روتے اسے بتایا تھا۔ میڈیکل باکس اور چادر لیتے صابرہ نے اسے دبے لفظوں میں منع کرنے کی کوشش کی تھی پھر چوکیدار کو ساتھ لے جانے کو بھی کہا تھا لیکن وہ اس کی کسی بھی بات کی پروا کیے بغیر ان کے ساتھ آ گئی تھی۔ لیکن تانگہ دوسرے گاؤں میں حویلی کے سامنے رکتے دیکھ کر وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کامے ہیں ہم چودھریوں کے۔ حویلی میں ہی کوارٹر ہے ہمارا۔" ان کے ساتھ اندر آتے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے کیا حالات درپیش ہونے والے ہیں۔

"تم ڈاکٹر ہو کہ جلاد، معمولی بخار تھا نہ جانے کیسی دوائیاں دی ہیں تم نے کہ تبسم اس حال کو پہنچ گئی ہے۔"

کھڑکھڑاتے کپڑوں اور بڑی بڑی مونچھوں والا چودھری کمرے میں ادھر ادھر ڈکراتا پھر رہا تھا۔ تبسم کے نام پر اسے شدید جھٹکا لگا تھا۔ بیڈ پر پڑی زرد رو لڑکی تبسم اور اس کی ماں پچھلے مہینے ہی تو اس کے پاس آئی تھیں۔ مگر اس نے انہیں کہاں دوائیاں دی تھیں۔

"اگر میری بہن کو کچھ ہوا تو میں۔" دانت کچکچاتے مٹھیاں بھینچتے وہ اس کی جانب بڑھا۔

"وے اپنے غصے کو قابو کر اور باہر جا۔ دیکھنے دے اسے تبسم کو۔ پہلے ہی اس کی طبیعت اوکھی لگتی ہے۔"

قریب کھڑی بڑی عمر کی عورت نے اس کے کچھ بولنے سے قبل ہی اس کرخت صورت شخص کو بازو سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔

"ڈونگے بنڈ کی حنیفاں نے ہمارا کام تو کر دیا ہے پر اس کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ اس کے بھرا کو میں نے جان بوجھ کر تیرا نام بتایا ہے اسے ابھی صرف یہی پتا ہے کہ تبسم کا بخار بگڑ گیا ہے۔ گل اس کے وسوں باہر ہو گئی تھی اس لیے تجھے بلوانا پڑا۔ تجھے پہلے ہی کہا تھا کہ ہم سے مت بگاڑ اب جو کرنا ہے تو نے کرنا ہے۔"

چودھرانی کی آواز میں سانپوں جیسی پھنکار تھی۔ سچویشن ایسی تھی کہ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

"انہیں ہسپتال لے جانا پڑے گا شہر کے ہسپتال ورنہ جان کو خطرہ ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

اسے اس کوٹھڑی میں بند کر کے وہ سب ہسپتال جا چکے تھے اور وہ خوف و دہشت سے بے ہوش ہونے کو تھی۔

☼ ☼ ☼

"ضیاء اس لیے بابا سے سفارش کی تھی میں نے تمہاری، حماد اور معیز کیا سوچتے ہوں گے۔ کیا گل کھلا رہے ہو تم یہاں "اسی لیے کیا تھا یہ سب۔ اتنا آگے جا چکے ہو تم اتنا۔"

اس کی بھاری آواز خار گلو بن گئی۔ اس کے لب و لہجے میں کیا تھا تعجب، تاسف، اچنبھا، جیسے ابھی بھی اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ فائقہ کی شادی کے بعد اس کا شہر میں پہلا چکر تھا۔ حماد اور معیز کو گھیر گھار کر وہ ہی فلیٹ تک لایا تھا۔ لیکن اندر داخل ہوتے ہی گھڑوں پانی اس پر پڑ گیا تھا لفظ کہیں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ سامنے نیم دراز مشہور ماڈل کا پورٹریٹ بناتے وہ اتنا مگن تھا کہ ان کے اندر داخل ہونے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا وہ جس حلیے میں تھی اسے دیکھ کر اس کے ساتھ وہ دونوں بھی شرمندہ ہو گئے تھے۔

"یار چلتے ہیں پھر ملیں گے ابھی تو ادھر ہو نا تم۔"

وہ دونوں جلدی سے باہر نکلتے چلے گئے اور وہ انہیں روک بھی نہیں سکا تھا روکتا بھی تو کیسے شرمندگی کے مارے سر اٹھایا نہ جا رہا تھا۔

"اسی لیے ماسی صغراں کو گاؤں بھیج دیا تھا تم نے۔" اس کی طرف اشارہ کرتے اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

"آرٹ اور آرٹ کی خدمت، یا۔"

اس کے لفظوں میں کھلی تضحیک تھی۔

"بہت بڑے آرٹسٹ ہو تم۔ باپ دادا کا نام روشن ہو رہا ہے تمہارے کارناموں سے۔"

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے دھنک کر رکھ دے۔ مشہور ماڈل کب کی جا چکی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے ایسا کیا کر دیا میں نے جو آپ آگ بگولا ہو رہے ہیں۔ پورٹریٹ ہی بنا رہا تھا میں کیا کر رہا تھا۔ آپ جیسے لوگوں کی سوچ کبھی نہیں بدل سکتی۔ دقیانوسیت کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔"

وہ بالکل شرمندہ نہیں تھا بلکہ اسے شرمندہ کر دیا تھا۔ اس کے لہجے میں اس کے لیے اتنی تلخی اور نفرت تھی کہ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

"آج کل تو نیوڈ کو بھی کوئی بنانے میں عار نہیں سمجھتا اور آپ۔"

اس کے بے باکی سے کہنے پر اس کا اٹھتا ہاتھ نیچے گر گیا۔ یقیناً" بہت کچھ غلط ہو چکا تھا اور اس بگاڑ کو سنوارنے کی کوئی امید اس کے ہاتھ نہیں تھی اس نے ایک نگاہ اس کے سلیبے بالوں اور رنگوں میں لتھڑے ہاتھوں پر ڈالی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا وہاں سے باہر نکل آیا۔ سارا دن شہر کی سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑانے کے بعد بھی اسے سکون نہیں ملا تھا۔ فائقہ کے یہاں ہوتے ہوئے وہ پھر بھی حد میں رہتا تھا اس کے جانے کے بعد تو کھل کھیلنے کی اجازت مل گئی تھی۔ غلطی کہاں اور کس سے ہوئی تھی وہ تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس کے حلیے کو تبدیل کرنے کی ناکام کوشش کرنے والا بھلا اس کی شخصیت کی گراوٹ کو کس طرح دور کر سکتا تھا۔ بابا کے بعد اس نے فائقہ اور ضیاء کا خیال رکھنے کی بہت کوشش کی تھی انہیں خود سے بڑھ کر چاہا تھا مگر اسے اب علم ہوا تھا کہ وہ کسی بھی کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ شاید یہ بابا کی دی چھوٹ تھی جس کا اس نے غلط مطلب نکال لیا تھا بہرحال جو بھی تھا وہ غلط راستے پر چل نکلا تھا اور اس کا لوٹنا بہت مشکل نظر آتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھابھی اپنے باپ اور بھائیوں کو ہمیشہ غلط سمجھتی رہی ہیں۔"

وہ حشمت عثمانی کے سامنے بیٹھا انہیں سن رہا تھا۔ حشمت عثمانی نے خود اسے بلوایا تھا وہ بہت سنجیدہ تھے۔

"لیکن تم لوگوں کے نکاح اور عتیق بھائی کی لمبی گمشدگی کے بعد وہ اسے رزاق یونس یعنی تمہارے بڑے بابا کی سازش سمجھنے لگیں عتیق تو تھا نہیں جس سے وہ اپنے دل کی بات کرتیں میرے ساتھ ان کی اتنی بے تکلفی نہیں رہی کبھی بھی۔ سلویٰ کو کچھ علم نہیں وہ بات کریں بھی تو کس سے۔ مجھے تو کچھ دن پہلے ہی ان کے شکوک کے بارے میں علم ہوا ہے۔ وہ اندر ہی اندر بیٹی کے مستقبل کے لیے اوہام کا شکار ہوتی رہیں۔ اگرچہ تمہارا رابطہ میرے ساتھ بھی کافی عرصے بعد ہوا۔ سلویٰ کی پڑھائی کی طرف بھرپور توجہ کے لیے میں نے اس سے بھی سب چھپائے رکھا لیکن اب علم ہوا ہے کہ بھابھی کے دل میں پڑنے والی گرہیں کتنی مضبوط ہو چکی ہیں، وہ ابھی تک بے یقینی کی کشتی میں ڈول رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس دولت کو ان کے شوہر نے کچھ نہ سمجھا وہ بھی اسے کوئی اہمیت نہیں دیتیں لیکن سلویٰ کی طرف سے وہ کافی پریشان ہیں۔"

وہ سانس لینے کو رکے۔ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ انہوں نے ٹیبل پر رکھ دیا۔ وہ کافی پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

"سلویٰ نے الگ پریشان کر رکھا ہے وہ اس ہسپتال میں نہیں رہنا چاہتی۔ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے یہی جاننے کے لیے آج میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ کچھ دن پہلے اس کا فون آیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔"

"مسئلہ تو کوئی نہیں شاید اس کا دل نہ لگ رہا ہو وہاں۔" فائقہ کی شادی کے بعد سے اس کی اس سے ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ فائقہ کی شادی پر بھی اس کا رویّہ بہت عجیب سا رہا تھا فائقہ کے بہت سے پیغام بھجوانے پر بھی وہ نہیں آئی تھی۔ مہندی کی رات اس نے اسے وہاں دیکھا تھا مگر بعد میں..... اور اسے اس کی طرف جانے کی فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔

"کیا وہ اس کی باتوں پر ناراض ہو گئی تھی لیکن اس نے تو ایسی کوئی بھی بات نہیں کی تھی۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آج ہی سلویٰ کی طرف جاؤں گا اور اس مسئلے کو بھی زیادہ دیر تک اسی طرح نہیں رہنے دینا بہرحال اب کچھ نہ کچھ حل ہو جانا چاہیے۔ مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے بلکہ جو میں اب کر رہا ہوں اسے بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا لیکن چچی کو تسلی دیں انشاء اللہ اب وہ دن دور نہیں جب ہم سب اکٹھے ہوں گے۔"

حشمت عثمان اس پرعزم نوجوان کی آنکھوں میں چمکتے روشنیوں کے جگنو دیکھتے رہے جو صبح کے ہونے کی نوید دے رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ اس کی خوابیدہ حسیں بے دار ہونے لگیں۔

"یا اللہ میری حفاظت کرنا تو جانتا ہے۔"

رو رو کر اس کے چہرے پر لکیریں بن چکی تھیں نہ جانے کیا وقت ہوا تھا ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔

"شاید وہ واپس آ گئے ہیں۔"

اس کی اپنی سوچ نے اسے دہلا دیا۔ کرخت چہرے والے شخص کا تصور کرتے ہی اسے جھرجھری آ گئی، وہ مزید دیوار کے ساتھ لگ گئی۔

"سلویٰ۔"

نہ جانے سماعت کا دھوکہ تھا یا واقعی کسی نے پکارا تھا۔ تڑپ کر آگے آتے اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر

آوازیں آنے لگیں۔

"سلویٰ آپ اندر ہیں۔" آواز جانی پہچانی تھی۔

"پلیز مجھے یہاں سے نکالو۔" بولتے بولتے وہ رو رہی تھی۔

"دروازہ توڑ دیں سر۔"

بھاری مردانہ آواز نے کسی سے پوچھا تھا۔ دروازے کو ضربیں لگائی جا رہی تھیں۔

"میڈم آپ دروازے کی رینج سے پرے ہو جائیں دیوار کے ساتھ کھڑی ہو جائیں۔"

دروازہ توڑنے والے اونچی آواز میں اس سے مخاطب تھے۔

"آپ بات سن رہی ہیں۔"

"جی سن رہی ہوں۔"

دیوار کے ساتھ کونے میں دبکی گھٹنوں کو بازوؤں سے جکڑے وہ ابھی تک کانپ رہی تھی۔

"کیا میں بچ گئی ہوں۔"

اس نے خود سے پوچھا۔ اللہ کو پکارا تھا اس نے اور جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا اللہ ہوتا ہے۔ اس کوٹھڑی نما کمرے میں اس کی سسکیاں گونجنے لگیں۔ شکستہ دروازہ کچھ ہی دیر میں ٹوٹ چکا تھا۔

"سلویٰ، سلویٰ!"

کوئی بڑی بے قراری سے اسے پکار رہا تھا۔ جانی پہچانی آواز پر اس نے گھٹنوں پر جھکا سر اوپر اٹھایا۔ تیمور ملک پنجوں کے بل اس کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے پولیس کی وردی میں کچھ لوگ نظر آ رہے تھے۔ اجنبیوں کی بھیڑ میں کوئی شناسا چہرہ نظر آنے پر جیسے انسان ایک دم اس کی جانب لپکتا ہے بالکل اسی طرح وہ بھی اس کی طرف لپکی تھی اس کے بازو کو تھامے وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"سلویٰ! ریلیکس ایوری تھنگ از او کے۔"

اس کے سر کو تھپکتے اس نے اسے تسلی دی مگر وہ روتے روتے اسی کے بازوؤں میں جھول گئی۔ شاید اس کی ہمت یہیں تک تھی اسے دیکھتے ہی اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

"تیمور کچھ بتاتا کیوں نہیں کیا ہوا ہے اسے۔"

بے جی نے اس کے زرد چہرے سے چپکے بال پیچھے ہٹائے۔ وہ آدھے گھنٹے سے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سکینہ اسے سکون آور انجکشن دے چکی تھی اور کسی حد تک ان عورتوں کی آمد کے بارے میں بھی بتا چکی تھی جو اس دن ہسپتال میں اس سے ملنے آئی تھیں ان کے بارے میں سلویٰ نے بعد میں اس سے بات بھی کی تھی وہ ان دونوں عورتوں کو جانتی تھی۔ اس نے بے جی کو سب کچھ بتا دیا وہ اس کی بے چینی، بے قراری اور اس کی بے ہوشی دیکھتے ادھر ہی موجود تھیں۔

"چودھری جہانداد اگر اسے کچھ ہوا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا میں۔"

اس کی پیشانی کے بلوں میں اضافہ ہو گیا۔ بھینچی مٹھیاں کچھ اور سختی سے بھینچ گئیں۔ خود سے عہد کرتے اس نے ایک بار اس کے کملائے چہرے کو دیکھا جو سرسوں کا پھول لگ رہا تھا۔ ساری شادابی، زردی میں ڈھل گئی تھی۔ آنسوؤں کی واضح لکیریں اور چہرے پر کھنڈی زردی دیکھ کر اس نے ایک بار پھر ہتھیلی پر مکا رسید کیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کہیں سے اسے دریافت کر کے سبق سکھا دے۔ ملکوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والا کیسے سکون سے گھوم رہا تھا۔

"اگر جو سکینہ اور صابرہ کو علم نہ ہوتا اور وہ اسے نہ بتاتیں تو......"

"پتر جا تھوڑی دیر سکون کر لے میں ادھر ہی ہوں اپنی دھی رانی کے پاس۔"

نہ جانے اس کے چہرے میں کیا بات تھی وہ ہر بار اس کی طرف کھنچتی چلی جاتی تھیں۔ تسبیح کے دانے گراتے انہوں نے ایک بار پھر اس کو دیکھا جو ابھی تک اذیت میں لگ رہی تھی۔

اس کا سویا ہوا دماغ بے دار ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر ارد گرد چھائے ملگجے اندھیرے کو دیکھا سنہری دھند ابھی تک دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ دماغ ابھی تک گھوم رہا تھا۔ اٹھنے کی کوشش میں چکرا کر

دوبارہ تکیے پر گر گئی۔ ایک آہ اس کے لبوں سے خارج ہوئی کھڑکی میں کھڑا سایہ اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔

"لیٹی رہیں آپ، طبیعت کیسی ہے آپ کی۔"

اس کے سرہانے کھڑے تیمور نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ ڈالے۔ گزرے لمحات ایک ڈراؤنی فلم کی طرح ذہن کی اسکرین پر چکرا رہے تھے۔

"مجھے گھر جانا ہے، پلیز مجھے گھر جانا ہے۔"

بے جی نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ آنسو خود بخود آنکھوں سے نکل کر ان کے دوپٹے میں جذب ہوتے رہے۔

"میری دھی یہ بھی تیرا گھر ہے۔ تو یہاں بالکل محفوظ ہے۔"

تیمور کے چہرے پر چھائے گہرے تفکرات اس کے لیے تھے۔ آنکھیں رت جگے سے سرخ تھیں وہ صحیح معنوں میں اس کا محسن تھا مگر اس کے لیے ناقابل اعتبار تھا۔ اجنبیوں کی بھیڑ میں جسے اپنا اور محسن جان کر اس کی طرف بڑھی تھی اس کی حرکت یاد آنے پر وہ اسی کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ حویلی نہ آنے کی قسم خود بخود ٹوٹ چکی تھی۔

"بس مجھے کچھ پتا نہیں مجھے ابھی گھر جانا ہے۔"

بچوں کی طرح ضد کرتی لڑکی شاید جانتی نہیں تھی کہ رات کے دو بج رہے ہیں۔

"رات کے دو بج رہے ہیں۔ آرام سے سو جائیں۔ بے جی آپ کے پاس ہیں میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔"

خشک لہجے میں کہتے وہ ایک دم ہی کمرے سے نکل گیا۔ پہلی بار اسے اپنی بچکانہ ضد کا احساس ہوا تھا۔ بے جی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں۔ عجیب تحفظ کا احساس تھا اس نے چکراتا سر تکیے پر رکھ دیا۔ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگی تھیں۔

ساری رات وہ ایک پل کے لیے بھی نہیں سو پایا تھا ساری غلطی اس کی تھی وہ اس کی منکوحہ تھی اس کی چچا زاد تھی۔ وہ بہت پہلے اسے بابا کے سامنے لا سکتا تھا۔ اپنی محبت کا اظہار کر سکتا تھا شاید اسے محبت کا اظہار ہی کرنا نہیں آتا تھا۔ سگریٹ کے لمبے کش بھی اسے پرسکون کرنے میں ناکام تھے۔ ایک طرف چچی فہمیدہ اس سے متنفر تھیں تو دوسری طرف سلویٰ کی ناپسندیدگی اس پر عیاں تھی تیسری طرف بابا کا رویہ جس میں ابھی تک کوئی لچک نہیں تھی اور اب جو کچھ ہوا تھا۔

وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا کئی بار اس کا دل چاہا کہ اسے دیکھ کر آئے پر اس نے خود پر قابو پا لیا۔

☼ ☼ ☼

صبح کی روشنی بھاری پردوں سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ بے جی کمرے میں نہیں تھیں۔ بھاری پردوں کے سبب ابھی تک کمرے میں ملگجا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے دکھتا سر اوپر اٹھایا سامنے کلاک پر دس بج رہے تھے۔ چپل پہن کر وہ باہر نکل آئی اسے ابھی یہاں سے جانا تھا۔ ہال کمرے میں وہ کسی سے فون پر محو گفتگو تھا۔ گرے پینٹ اور وائیٹ شرٹ میں وہ عام دنوں سے مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی طرف پشت ہونے کی بدولت اس نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا تھا۔ ساری رات وہ عجیب و غریب خواب دیکھتی رہی تھی اس نے مشکلوں میں گھبرا کر تیمور کو پکارا تھا اور وہ ہر خواب میں اسے مصیبتوں سے چھٹکارا دلا رہا تھا شاید یہ کل کے واقعے کی بدولت تھا۔

"معاملہ تو بعد میں بتاؤں گا آ کر۔ فی الحال میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں آج گڑیا اور چچی کو لینے آ رہا ہوں، جی آپ کی طرف آؤں گا پہلے۔ بس بہت ہو چکا اب بابا کو قبول کرنا پڑے گا ان کو۔ پہلے میں نے سوچا تھا مناسب وقت آنے پر لیکن یہ ہی صحیح وقت ہے۔ شاید مجھ سے پہلے بے وقوفی ہوتی رہی ہے۔ جب ان کو ضرورت تھی اس وقت میں ان کو تلاش کرتا رہا اور بعد میں......"

اس کی آواز میں حد درجہ سنجیدگی تھی۔ آواز کے اتار چڑھاؤ سے محسوس ہو رہا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہے۔

وہ تو اسے کہنے آئی تھی کہ اسے لاہور جانا ہے مگر وہ تو اپنے ہی مسائل میں الجھا ہوا تھا۔

"کیا وہ چچی سے اتنی محبت کرتا ہے؟"

وہ شاید دوسری طرف سے آنے والی آواز کو سن رہا تھا۔ ایک دم ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"بابا سے کیا وعدہ مجھے پورا کرنا ہے۔ اگر چچا سب کچھ چھوڑ کر جا سکتے ہیں تو میں بھی ان ہی کا بھتیجا ہوں۔ اگر وہ میری منکوحہ اور چچی کو ان کا مقام دینے پر تیار ہیں تو ٹھیک ورنہ ان کی جائیداد کی چچا کی طرح مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں۔ چچا کی تعلیم نامکمل تھی لیکن انہوں نے سچائی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا میرے پاس تو ڈگری بھی ہے اور عزم بھی۔ وہ صرف میری منکوحہ ہی نہیں میری محبت بھی ہے۔"

اس کی آواز میں بولتی سچائی پر جہاں وہ ایمان لے آئی تھی وہیں "میری منکوحہ" نے اسے ایک دم زرد کر دیا تھا۔ اس کی "محبت" نے دل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا دل کیوں رک رک کر چل رہا تھا۔ اس کے خاندانی قصوں، لڑائی جھگڑے، ناچاقی اس کی سچائی سے بھلا اس کا کیا لینا دینا تھا۔ اسے تو آج یہاں سے واپس چلے جانا تھا کبھی بھی نہ آنے کے لیے۔ اس کے فون رکھنے سے پیشتر ہی وہ دوبارہ کمرے میں آ گئی تھی۔ یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ اسے اس کے نکاح اور اس کی محبت کے بارے میں علم ہو گیا تھا۔ دل میں جو تکلیف اس کی حرکت کے حوالے سے جاگتی تھی وہ بھی ختم ہو جاتی۔

☼ ☼ ☼

"بابا بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو صحیح سمجھ رہے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں ہم صحیح راستے پر نہیں ہوتے اور جب ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں رہ جاتا نہ زندگی، نہ محبت اور نہ ہی رشتے ناتے۔ باہر سے چاہے ہم اکیلے نہ بھی ہوں ہمارے اندر تنہائی ہوتی ہے اور یہ تنہائی بڑی بری چیز ہے۔"

وہ چار دن سے رفیع کے ساتھ تھے آج رات تین بجے واپس آئے تھے اخبار سامنے رکھے وہ اخبار سے زیادہ اپنے عزیز از جان پوتے کے چہرے کو پڑھ رہے تھے جو حد سے زیادہ سنجیدہ تھا۔

"بھئی جوان آج خیر سے سویرے سویرے کسی فلاسفر کی روح حلول کر گئی ہے تمہارے اندر۔"

بہت دنوں بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی اس لیے ان کا موڈ بہت اچھا تھا۔ ویسے بھی توفیق سے ملتی اس کی شکل کی بدولت وہ انہیں کچھ زیادہ ہی پیارا تھا۔ وہ اس کی کوئی بات جھٹلا نہ سکتے تھے اس کی گہری بات پر وہ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتے رہے پھر خوش گوار مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپ کا کیا خیال ہے۔"

وہ ابھی بھی بہت سنجیدہ تھا۔ سفید شرٹ اور گرے پینٹ میں ہلکی شیو کے ساتھ وہ انہیں کچھ مضطرب لگا تھا۔ یہ بات ان سے بڑھ کر کون جانتا تھا انہوں نے بھی ساری زندگی اپنے آپ کو صحیح راستے پر سمجھا تھا۔ جوانی میں بھی اپنی مرضی کی تھی اور جب اولاد جوان ہوئی تو تب بھی لیکن توفیق کے جانے کے بعد بلکہ بہت بعد میں انہیں احساس ضرور ہوا تھا کہ وہ صحیح ہوتے ہوئے بھی صحیح نہیں تھے۔ نذیر احمد نے اگر ان کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا تو سزا انہوں نے اپنے ہی بیٹے کو دی تھی کہتے ہیں کہ گناہ گار کو اس کے کیے کی سزا ملتی ہے لیکن انہوں نے سزا کسے دی تھی اپنی بہن کو اور اپنے بیٹے کو۔ نذیر احمد کو تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ساری زندگی وہ اپنے بیٹے کے لیے تڑپتے رہے تھے ان کا طنطنہ انہیں کمزوری نہ دکھانے دیتا تھا اگر وہ اس کے پاس نہیں گئے تھے تو وہ کون سا ان کے پاس آ گیا تھا۔ اس کی ہٹ دھرمی دیکھتے گاہے بہ گاہے وہ اس کے خلاف باتیں بھی کیا کرتے تھے لیکن اندر کی تنہائی روز بہ روز بڑھتی چلی گئی تھی۔ انیس انہیں چھوڑ کر خاندان کے ساتھ باہر سیٹل ہو چکا تھا۔ عتیق اور اس کی بیوی بڑھاپے میں ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے اور توفیق تو سب سے پہلے جا چکا تھا اس نے باپ کا ساتھ دینے کی بجائے سچائی کا ساتھ دیا تھا اور ابھی تک نبھا رہا تھا۔ کتنے اکیلے

تھے وہ تنہا۔ اگر تیمور نہ ہوتا تو... اور ان کی ساری کی ساری توانائیاں تیمور کے دم سے تھیں۔

راکنگ چیئر پر جھولتے وہ کئی سال پیچھے چلے گئے تھے اور شاید یہ بھی بھول گئے تھے کہ وہ ان کے سامنے کھڑا ہے۔

"بابا اگر چچا آپ کے سامنے آجائیں۔"

بات ادھوری چھوڑ کر وہ ان کی سمت دیکھنے لگا جو کرسی پر جھولتے ایک دم ساکت رہ گئے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا تھا لیکن اس سوال کا جواب دینے میں انہیں شاید صدیاں درکار تھیں۔

"تم ملے ہو اس سے۔"

جواب دینے کی بجائے انہوں نے ایک اور سوال کر دیا۔

"ہاں بہت پہلے، جب میں دس سال کا تھا۔ بابا کے ساتھ چچا کے گھر گیا تھا۔"

وہ تیمور کو ڈانٹنا چاہتے تھے۔ توفیق کو برا بھلا کہنا چاہتے تھے لیکن نہیں کہہ پا رہے تھے۔ اس سے نفرت اور بے گانگی کا اظہار کرنا چاہتے تھے لیکن تیمور کو غور سے سنتے تشنگی سیراب ہو رہی تھی ایسا کیوں تھا وہ نہیں جانتے تھے لیکن یہ ہی حقیقت تھی کہ وہ اس کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتے تھے۔ دکھ تو یہ تھا کہ جس کے لیے ان کا بیٹا ان سے جدا ہوا تھا وہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ نذیر احمد چودھری جو فرحت کی محبت کے بخار میں مبتلا تھے محبت کا یہ بخار ان کی جان اور جائیداد لے کر اترا تھا۔ جب وہ اسے سوچتے احساس زیاں کچھ اور بھی بڑھ جاتا۔ کاش کوئی گزرا زمانہ لوٹا سکتا۔ نہ جانے ان کا بیٹا کہاں تھا۔

آہستہ آہستہ وہ انہیں بتا رہا تھا۔ شروع سے لے کر آخر تک ان کی مختلف جابز، فہمیدہ کے بھائیوں کا تنگ کرنا، ان کی ٹیوشنز، چچا کی فیملی کا اچانک کہیں چلے جانا، اس کی تلاش، چچا کی وفات اور پھر سلویٰ کا اس جگہ آنا۔ وہ عالم صفت شخص جس کی آنکھ میں کبھی کسی نے آنسو نہیں دیکھے تھے بلک بلک کر رو رہا تھا آنسو قطار در قطار داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔

"اس نکاح کو اناؤنس کرنا ضروری ہے تاکہ اس کی حیثیت کا تعین ہو سکے۔ جلد از جلد۔"

ان کے آنسو صاف کرتے وہ انہیں بتا رہا تھا۔ نئی صورت حال کے پیش نظر یہ بہت ضروری تھا۔

جس کام کو وہ بہت مشکل سمجھ رہا تھا وہ تو بہت آسان ثابت ہوا تھا۔ اوپر سے سخت اور بے لچک نظر آنے والے رزاق یونس تو کب کے بدل چکے تھے کبھی کسی نے ان کے اندر جھانکنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اگرچہ دیر ہو چکی تھی لیکن پھر بھی بہت دیر نہیں ہوئی تھی ابھی وقت کی لگامیں ان کے ہاتھ میں تھیں وہ اپنے بیٹے کو اس کی اولاد کی صورت سینے سے لگا سکتے تھے۔

"نوید سے کہو گاڑی نکالے۔ اپنی بے جی کو بھی ساتھ لے لینا انہیں کچھ بتانا نہیں۔ رفیع کو فون کر کے کہہ دو شام کو دلہن اور بچوں کو لے کر پہنچ جائے۔"

بے چینی سے کہتے وہ پر لگا کر وہاں پہنچ جانا چاہتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یہ لوگ اسی قابل ہیں کہ کوئی یہاں نہ آئے۔ آنے والوں کے ساتھ ان کا سلوک ایسا ہی ہے اسی لیے کوئی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا نا جانے پہلے آنے والے ڈاکٹرز کے ساتھ کیا کیا کیا ہو گا۔"

خوف کے زیر اثر اس کے دماغ میں گاؤں اور لوگوں کے بارے میں منفی خیالات گردش کر رہے تھے وہ متنفر ہو رہی تھی ہر چیز سے۔ اس نے جو گھنٹے وہاں گزارے تھے ان کی یاد چپک کر رہ گئی تھی۔

"وحشیوں کو سنوارنے کی کوشش کی جائے پر وہ ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں مجھے اب بھی یہاں نہیں آنا کبھی بھی نہیں۔"

اس شخص کے خوف ناک انداز ابھی بھی اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے۔ اس کا اثر و رسوخ کام آیا تھا جس کے نتیجے میں وہ یہاں موجود تھی اگر وہ بروقت وہاں

پہنچ نہ جاتا تو کیا ہوتا۔ ہاں وہ رحمت کے فرشتے کی طرح وہاں پہنچا تھا۔ اس کے بارے میں جذبات کچھ بدل گئے تھے۔ یقیناً" وہ تالاب میں پلنے والی گندی مچھلیوں کے بارے میں جانتا تھا اسی لیے اسے روکتا تھا اور وہ اپنی ازلی خود سری کے باعث اسے بھی اس کا رعب سمجھتی تھی۔ اسے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا پر اس کے منہ سے ایک لفظ بھی تشکر کا نکل نہیں پایا تھا۔ جہاں اس کے بارے میں اس کے احساسات بدلے تھے وہیں اس کی ٹیلی فونک گفتگو نے عجیب بے چینی اور مخمصے میں ڈال دیا تھا۔

وہ جلد سے جلد یہاں سے جانا چاہتی تھی اور وہ اپنے ہی کاموں میں الجھا ہوا تھا۔

"وہ لڑکی ہسپتال پہنچ کر بچ گئی تھی پر اس کے بھائی کو جب سارے قصے کا پتا چلا تو اس نے خود ہی گلا گھونٹ دیا اس کا کہتے ہیں اب پولیس کی حراست میں ہے۔"

سکینہ ہسپتال کی بجائے اس کے پاس موجود تھی۔

"بے جی کو بتا کر ڈرائیور کے ساتھ چلے جانا چاہیے۔"

بس وہ جلد سے جلد یہاں سے جانا چاہتی تھی امی کے پاس اپنوں کے پاس بیٹھے بیٹھے ہی اس کا دھیان رفیق کی طرف مڑ گیا۔ رفیق بارہ سال کا لڑکا جو چھت سے اینٹ گرنے کے باعث زخمی ہو گیا تھا اور جب زخمی حالت میں اس کے پاس لایا گیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتی تو کیا وہ..... ایک دم ہی بہت سے دوسرے لوگ جو روز اسے دعائیں دیا کرتے تھے یاد آنے لگے تھے وہ یہاں مجبوری کے تحت آئی تھی مگر اب اس جگہ کو چھوڑ کر جانا تکلیف دہ بھی تھا مگر کوئی بھی چیز اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر نہیں تھی۔ ہاں اسے اب یہاں نہیں رہنا تھا۔

☼ ☼ ☼

سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ اسے کچھ بھی سوچنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ بے جی' بابا اور تیمور امی کے پاس موجود تھے۔ حشمت انکل بھی مستقل وہیں موجود تھے۔ بابا اور بے جی کو اپنے پاس دیکھ کر امی کے آدھے گلے شکوے تو خود ہی ختم ہو گئے تھے اور آدھے شکوے حشمت انکل نے حقائق بیان کر کے دور کر دیے تھے۔ بابا اور بے جی کی محبت کے سامنے زیادہ دیر تک ان کی نفرت زندہ نہیں رہی تھی اور پھر وہ بھی تو تھا جس کی بدولت آج انہیں اپنا کھویا مقام مل رہا تھا۔ کتنی تعریفیں کی تھیں انکل نے ان کی۔ جلتی دھوپ میں جلنے کے بعد سایہ نصیب ہو رہا تھا وہ بھلا کیسے اس سے انکار کرتیں۔ گزرے وقت کا ازالہ تو نہیں کیا جا سکتا تھا مگر حال کو نظر انداز کر کے مستقبل کی بہتری کا سوچنا بھی عبث تھا ان کی بیٹی کا مستقبل ان کے فیصلے پر تھا اور وہ فیصلہ جو ان کے محبوب شوہر بہت پہلے کر چکے تھے اسے وہ کس طرح نظر انداز کر سکتی تھیں اور پھر اپنے باپ کے کیے پر وہ ساری عمر شرمندہ رہی تھیں سب بہت خوش تھے۔ بے جی کی محبت بابا کے لیے دیکھ کر ماحول بہت دیر تک سوگوار رہا تھا۔

بے یقینی میں تو وہ ڈول رہی تھی۔ تایا اور عادل جنہیں وہ ایک عرصے تک ڈھونڈتی رہی تھی۔ حقیقت سامنے آئی تھی تو اسے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا بچپن کی یادوں میں وہ دن محفوظ تھا جس دن بابا اور تایا ابا بہت خوش تھے وہ خود مرکز نگاہ تھی لیکن اس خاص دن کے بارے میں اسے آج علم ہوا تھا عادل کو تیمور عادل کے روپ اور ایک رشتے کے حوالے سے دیکھتے ذہن میں سوچیں ہی سوچیں تھیں۔ امی بابا نے انہیں ہر چیز ہر رشتے سے لاعلم کیوں رکھا تھا کیا مصلحت تھی اس میں وہ ابھی تک سمجھ نہ پائی تھی وہ تو سرے سے رشتوں سے خاندان سے ہی ناواقف تھی کجا اتنے رشتے۔

ابھی وہ ایک حادثے اور جھٹکے سے ہی سنبھل نہ پائی تھی کہ دوسرا حادثہ دوسرا جھٹکا اس کے حواس کو مختل کر گیا تھا۔ ارجمند کا کہنا تھا۔

"یہ تو کوئی انیس سو ڈیڑھ کا لکھا ناول لگ رہا ہے۔"

ارم' ارجمند اور مزنہ کو چٹکلے سوجھ رہے تھے اس کی بے زاری عروج پر تھی۔ بے جی اور بابا کی محبتوں کے آگے وہ سب بے بس تھے حویلی میں نیر بھابھی' رفیع

عادل' بے جی کی بہنیں ان کے بچے' بابا کے بھائیوں کی اولادیں استقبال کے لیے جمع تھیں۔ اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر وہ دونوں بوکھلائی ہوئی تھیں۔ حشمت انکل' آنٹی' ارم اور ارجمند کو بھی بابا ساتھ لے آئے تھے۔

"پرانے لوگ نئی نسل کے فیصلوں کو نہ جانے کیوں جلد بازی کے فیصلے سمجھتی ہے۔ اپنے بیٹوں کے کیے فیصلے کو آج ہی لوگوں کے سامنے لاؤں گا۔ خوشیاں دوبالا ہو جائیں گی۔"

بابا کی آواز میں مسرتوں کی جگمگاہٹیں تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا تھا۔"

"کیا یہ خواب تھا۔"

اس نے حویلی میں بھی بہت خواب دیکھے تھے سب ادھوری جن کا کوئی سرپیر نہیں تھا بعد میں اپنے خوابوں پر سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ شاید یہ سب بھی ایک خواب تھا مگر نہیں سب مجسم لوگ حقیقت کی طرح اس کے اردگرد موجود تھے۔ اس کا دماغ پہلے ہی شل تھا کچھ بھی سوچنے سے قاصر یا شاید سوچوں سے شل۔

☼ ☼ ☼

ہر طرف سکون ہی سکون تھا اگر کہیں بے سکونی تھی تو اس کے اندر اور اندر بھی بھلا کوئی جھانک سکا ہے اس کے اردگرد سب خوش تھے بے تحاشا خوش و خرم۔ امی کو کھویا مقام مل چکا تھا دیر سے سہی انہیں عزت اور وہ مقام حاصل ہو چکا تھا جس کی وہ مستحق تھیں۔ دادا دادی کی محبت اس پر برسات کی بارش کی طرح برس رہی تھی۔ پرانے رشتے بحال ہو چکے تھے۔ سب کچھ تھا مگر اس کے اندر کی دنیا کیوں تہ و بالا تھی۔ تیمور کے لفظوں سے سچائی جھلکتی تھی۔ اپنی سچائی کو اس نے عمل سے ثابت کر دکھایا تھا۔ اگر آج وہ اس حویلی میں مزنہ' امی اور عزت کے ساتھ موجود تھی تو سب اسی کی بدولت تھا۔ پھر اس دل کے اندر سناٹا کیوں تھا او چیخ رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی بال کھولے ہوئے تھی۔ اس کا دل اسے برے کردار کا ماننے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن۔

"جو شخص ایک منٹ کے اندھیرے سے فائدہ اٹھانے کے لیے بے قابو ہو سکتا تھا اس سے اور کیا بعید تھا۔"

آج وہ اس کے کمرے میں اس کی بیوی کی حیثیت سے موجود تھی نہ جانے دل کیوں ایک دم ہی ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ بابا کے فیصلے کو جھٹلانے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ امی بہت — خوش تھیں اور خود اس کی زندگی بھی تو ادھورے پن سے نکل کر رشتوں سے مکمل ہونے چلی تھی۔ عدم تحفظ کا شکار وہ خود ایک دم بابا کی محبت اور حفاظت میں آ گئی تھی۔ پھر اندر یہ بے چینی کیسی تھی جو اسے مکمل خوش بھی نہ ہونے دے رہی تھی۔ اس کے لیے سب کچھ بہت عجیب تھا کھوئے رشتے' نکاح' حویلی لیکن حقیقت تو یہی تھی۔ ولیمہ بیس دن بعد تھا۔ لیکن آج اسے رخصت کر دیا گیا تھا ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک کی رخصتی۔ کمرے کی آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ہر چیز میں پیچ کلر نمایاں تھا' فرنیچر' پینٹ' پردے' قالین سب کچھ اس کا ذوق یقیناً" اچھا تھا وہ بے جی کی پسندیدہ چیزوں کے ساتھ تھی' کپڑے' جوتے' اور کیا کیا۔

"سارے ارمان انشاء اللہ ولیمہ پر پورے کروں گی۔ میرے توفیق کی بیٹی اور تیمور کی دوہنٹی کے آنے سے کیسا چانن ہو گیا ہے ہر طرف۔"

ان کی خوشی دیدنی تھی۔ بھاری زیورات اسے الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ ایک ایک کر کے اس نے انہیں بیڈ پر رکھ دیا۔ بے جی کے خاندانی زیورات' تیمور کی دلہن کے لیے رکھے زیورات اس کے جسم پر بہار دکھا رہے تھے۔ میک اپ صاف کر کے کپڑے تبدیل کیے اور صوفے پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا۔ وہ اپنی کیفیت خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

☼ ☼ ☼

"یار بس ایک اور بازی۔"

وہ تاش شوق سے کھیلتا تھا اور نہ ہی اتنا اچھا کھلاڑی تھا پر وہ دونوں اس کے درپے تھے۔ حماد اور معیز کو یہاں بلا کر اس نے یقیناً" غلطی کی تھی وہ دونوں کسی بھی طرح اس کی جان چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ معیز نے اسے پچکارتے حماد کو آنکھ ماری اور پتے پھینٹنے لگا۔ حماد نے اس کی شکل دیکھ کر بڑی مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی تھی۔

"یار چھوڑ دے اب بے چارے کی جان۔ نہ جانے کتنی گالیاں دے چکا ہو گا اس وقت تک ہمیں۔"

حماد نے بازو سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور اسے دروازے کی سمت دھکا دے دیا۔

"ویسے تیرے کرتوت اس قابل نہیں کہ تجھے بخشا جائے لیکن جا بخش دیا تجھے۔" اس نے فیاضی دکھاتے شاہانہ انداز اختیار کیا۔

نرم گرم جذبات اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے کمرے میں قدم رکھا مگر کمرے کا منظر دیکھتے ہی سارے جذبات کہیں ہوا ہی میں تحلیل ہو گئے تھے۔ کیا کچھ نہ سوچ ڈالا تھا اس نے اس کے حوالے سے۔ دل پر کیسی بے اختیاری اس کے آجانے سے چھائی ہوئی تھی۔ دل کی حالت عجیب تھی۔ اس کے سارے جذبات پر مٹی ڈال کر وہ کیسے سکون کی نیند سو رہی تھی۔ کمرے کے وسط میں کھڑا کبھی وہ بیڈ اور کبھی صوفے کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

ایسا کیوں کیا تھا اس نے، وہ اسے کیا احساس دلانا چاہتی تھی۔ کیا اس بات کا احساس کہ اس کے نزدیک وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ کیا وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔

کتنے ہی سوال ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ لیکن اس کے پاس کسی ایک کا جواب بھی نہیں تھا۔ ایک بار اس کا دل چاہا اسے جھنجھوڑ کر جگا دے لیکن اس کی مردانہ انا نے اس کے ہاتھ روک لیے۔

ع وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو

اپنی توہین اسے گوارا نہیں تھی۔ بیڈ پر عجیب مینا بازار سجا ہوا تھا۔ چوڑیاں، زیورات، میک اپ باکس سر کی پنیں، اس کے کپڑے اور وہ خود کتنے آرام سے صوفے پر محو استراحت تھی۔

دماغ کو چڑھنے والی گرمی نے اسے ایک دم ہی تپا دیا تھا۔ تنتناتے ہوئے اس نے ایک دم کمبل کا کونا پکڑ کر کھینچ دیا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی آنکھیں خوف کی زیادتی سے پوری کھلی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈورے اور اچانک نیند سے جاگنے والی ہڑبڑاہٹ ابھی تک چہرے پر موجود تھی۔ حواس سنبھلتے ہی اس نے صوفے کی پشت پر پڑا دوپٹا جلدی سے اوڑھ لیا۔ وہ ابھی تک اس کے سر پر کھڑا خوفناک تیوروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"آپ کا ادنیٰ غلام ہوں کہ آپ کا پھیلایا ہوا گند سمیٹوں اور پھر سکون کی نیند سو سکوں۔"

اس کی غراہٹ سے دہل کر وہ کھڑی ہو گئی۔ بیڈ کی چیزوں کو سمیٹتے وہ بوکھلاہٹ کا شکار تھی۔ اس کے خالی کیے صوفے پر بیٹھتے اس نے شیروانی کے بٹن کھولے اور اسے اتار کر دوسرے صوفے پر اچھال دیا۔ قمیص کی آستینیں فولڈ کیں، جوتے اتارے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس کا جائزہ لینے لگا۔ بوکھلاہٹ میں اس سے کوئی بھی کام صحیح نہ ہو رہا تھا۔ کچی نیند سے اس طرح جگایا جانا اور پھر اس کے خوفناک تیور دہلائے دے رہے تھے۔ ابھی تک دل ہی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

"بدتمیز، جنگلی، اجڈ۔"

ہمیشہ کی طرح دل ہی دل میں اسے خطابات سے نوازتے وہ چوڑیوں کو باکس میں رکھے اور میک اپ ریمور کو کپڑوں میں لپیٹے ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ آتشی گلابی شلوار قمیص میں اس کا پر بہار سراپا اسے دعوت نگاہ دے رہا تھا۔ دوپٹا ایک کندھے پر جھول رہا تھا۔ ریشمی سلکی بال کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ اس کے ڈریسنگ روم میں جاتے اس نے شکر کا کلمہ ادا کیا اور ساری چیزیں سمیٹ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ عجیب دھماکے سے ہو رہے تھے سر میں۔

"نظرباز، فضول شخص۔"

ایک نیا لقب دیتے اس نے دانت کچکچائے۔ بیڈ پر لیٹ کر اس نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

"کیسے مگرمچھ کی طرح پھیل گیا ہے۔"

تھوڑی دیر پہلے کی بھاگ دوڑ اسے کھولا رہی تھی اسے دیکھ کر اسے ایک مگرمچھ کا ہی خیال آیا تھا۔ ایک اس زاویے پر بیٹھی وہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"مس سلویٰ۔"

خاموش کمرے میں اس کی بھاری و گمبھیر طنزیہ آواز گونجی۔ دل سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

"لائٹ آف کر دیں اور یہ سوچ بچار کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔"

طنزیہ گفتگو کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔

"ادنیٰ غلام ہوں آپ کی؟"

اسی کے انداز میں جواب دے کر اس نے جلدی سے پاؤں اوپر کیے، کمبل سر تک اوڑھا اور دونوں اطراف سے نیچے دبا کر جیسے خود کو قلعہ بند کر لیا۔ شدید غصے میں ہونے کے باوجود تیمور کو اس کے انداز پر ہنسی آئی تھی۔

"آدھی رات تک دلہن چاچی کو دیکھنے کی فرمائش کرتے رہے ہیں صاحب زادے۔ میں نے کہا منے سو جا ورنہ میں ماروں گی اور اگر تجھے وہاں لے گئی تو چچا ماریں گے۔"

نیر بھابھی بہت خوش مزاج تھیں ذکوان تین سال کا تھا کل بھی سارا دن اس کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ بھابھی کی معنی خیز ہنسی پر اس نے جھینپ کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا پھر ذکوان کو اٹھا کر وہ اس سے باتیں کرنے لگی۔

"فائقہ کہہ رہی تھی میری طرف سے تین بھو کے جڑ دینا اسے۔ میں بھابھی کو آکر پوچھوں گی۔ ایک وقت میں سارے پرانے الف لیلوی قصوں کو ... ایام ہوتا تھا جب میں آ نہیں سکتی تھی۔"

فائقہ سے اس کی بھی بات ہوئی تھی اسے اپنے نہ آسکنے کا از حد قلق تھا۔

"فائقہ کی شادی پر پہلی بار دیکھا تھا تمہیں کیا پتا تھا اتنا قریبی رشتہ ہے دیورانی بن کر اسی گھر میں رونق بڑھانے آ رہی ہو۔"

فائقہ کی شادی کا ذکر ہمیشہ اسے بدمزا کر دیا کرتا اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر چھا جانے والی اچانک سنجیدگی نے نیر بھابھی کو ایک سیکنڈ کے لیے خاموش کر دیا۔

"اے دیورانی جی، کیا تحفہ ملا، منہ دکھائی۔" اس نے بوکھلا کر اس کی سمت دیکھا۔

"اے نیر کدھر ہو بھئی ثناء منہ پھاڑ کر رو رہی ہے کب سے پتا نہیں کیا ہوا ہے آکر دیکھو اسے۔۔"

رفیع بھائی کی آواز پر نیر بھابھی کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ ان کے باہر جاتے ہی اس نے ایک لمبی سانس لی اور اپنے جذبات، احساسات سے عاری دل کے بارے میں سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"توفیق سے اتنی محبت کرتے تھے تمہارے بابا کہ اس کے جانے کے بعد بہت بدل گئے۔ وہ اسے یاد کرتے تھے لیکن کسی کو کچھ بتاتے نہیں تھے اتنے گہرے تو کبھی بھی نہیں رہے تھے تمہارے بابا۔ عتیق اور انیس سے بھی محبت تھی لیکن توفیق کی بات ہی اور تھی اور اس کی ایک بار کی سزا ساری زندگی ختم نہ ہو سکی۔"

آہستہ آہستہ بولتے بے جی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پرانی یادوں کو سینے سے لگائے انہوں نے ساری زندگی ایک لاحاصل انتظار میں گزار دی تھی۔ مزنہ اور امی کو نیر بھابھی اپنے ساتھ پنڈی لے گئی تھیں انہوں نے تو اسے بھی بہت زور دے کر کہا تھا پر بے جی نے اسے روک لیا تھا۔

"ہم سارے اکٹھے آئیں گے تمہارے بابا، میں، تیمور اور سلویٰ۔"

ضیاء صرف ایک دن کے لیے آیا تھا اور رکے بغیر واپس چلا گیا تھا شاید اسے کسی معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

تیمور کے ساتھ اس کا رویہ وہی کھنچا کھنچا سا تھا۔ دل اس کی طرف کھینچتا تھا پر اس کی حرکت اسے اذیت کی آخری حدوں پر پہنچا دیتی پہلے دن کی بدمزگی کی بدولت یا تو وہ اس کے آنے سے پہلے سو جاتی یا اس وقت تک بے جی یا بابا کے پاس بیٹھی رہتی جب تک اسے یقین نہ ہو جاتا کہ وہ سو چکا ہوگا۔

"بے جی نئی فیکٹری میں کچھ مسئلہ ہو گیا ہے آج میں گھر نہیں آسکوں گا۔"

وہ بے جی کے ساتھ مصروف تھی جب بے جی کو بتا کر وہ تیزی سے باہر نکلنے لگا۔

"پتر کیا مسئلہ ہے مجھے بھی تو بتا۔"

بے جی تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں۔

"کچھ خاص نہیں آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے ایک لمبا سانس لیا جیسے یکدم آزادی مل گئی ہو۔ بے جی نماز پڑھنے جا چکی تھیں وہ پوری طرح ہارر مووی میں گم تھی۔

ہارر فلم دیکھتے اسے ڈر بھی لگتا لیکن وہ دیکھتی ضرور تھی۔ بیڈ پر پھیل کر لیٹتے اس نے جیسے آزادی کو انجوائے کرنا چاہا۔

"صرف آج کی رات نہیں بلکہ چار پانچ راتیں وہیں گزار آنا۔"

اس نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا جیسے وہ سن ہی تو رہا ہو فلم کب کی ختم ہو چکی تھی پر اسے خوف کی بدولت نیند نہیں آرہی تھی۔

"بے جی پلیز آپ میرے پاس سو جائیں۔"

تسبیح پڑھتی بے جی کو وجہ بتا کر ساتھ سونے کی التجا کرنے لگی۔

"اگر ڈر لگتا ہے تو ڈراؤنی فلم دیکھتی کیوں ہے۔"

"بس مجھے نہیں پتا آپ میرے ساتھ چلیں۔"

"اچھا آرہی ہوں میں لیٹو چل کے تم۔"

بے جی کے آنے سے ایک دم سکون ہو گیا تھا سارا خوف دم دبا کر کہیں بھاگ گیا تھا۔ پہلے نیند کوسوں دور تھی پر بے جی کے آنے سے آنکھیں خود بخود بند ہونے لگی تھیں کتنے دنوں کے بعد وہ آرام دہ جگہ پر سو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

پیریوں والی زمین پر لگنے والی فیکٹری میں مشینیں لگ چکی تھیں۔ مقتدر اور زمان نے اسے بتایا تھا کہ کچھ دن پہلے آنے والی دو مشینوں کے پرزے غائب تھے۔ مشینیں باہر سے منگوائی گئی تھیں اور بہت مہنگی بھی تھیں اسے ان کی بہت فکر تھی آج کی رات اس کا ارادہ یہیں رکنے کا تھا بلکہ شاید کچھ مزید دن بھی یہیں رکنا پڑتا مگر کچھ دیر بعد ہی نشئی بابر اور اچھو مینک پکڑے گئے تھے۔ آج رات ان کا ارادہ دوسری مشینوں سے پرزے چرانے کا تھا۔ یہ مسئلہ سلجھانے کے بعد اسے حویلی کی فکر ہوئی تھی سلوٹی اور بے جی اکیلی تھیں۔ وہ اسی وقت واپس آگیا تھا۔

اپنے کمرے میں بے جی کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔

"بے جی لیٹی رہیں میں گیسٹ روم میں سو جاتا ہوں۔"

وہ ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ دھیمی آواز میں کہتے اس نے قدم باہر کی سمت بڑھا دیے۔ بے جی بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی تھیں۔

"نئی جگہ پر مجھے تو نیند نہیں آتی۔ اس لیے ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اپنے کمرے ہی میں جا کر سوؤں گی تم بتاؤ کیا مسئلہ تھا۔"

مختصر لفظوں میں انہیں قصہ بتا کر اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔

"آدھی رات تو گزر گئی جا میرا پتر سو جا جا کر۔"

انہوں نے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ زلفیں تکیے پر پریشان تھیں اور وہ مسکرا رہی تھی بیڈ کے درمیان لیٹے پورے بیڈ پر اس کا تصرف تھا عجب لاپروا انداز تھا سونے کا یا وہ اسے پہلی بار اس طرح دیکھ رہا تھا۔ معصوم چہرے پر مسکراہٹ بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ لائیٹ جلانے سے بھی اس کی گہری نیند پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ وہ اسے دیکھنے کا حق رکھتا تھا۔

دیکھ کر دل پر قابو پانا کتنا مشکل تھا۔ ایک لمبا سانس لے کر اس نے خود پر قابو پایا بیڈ کے ایک طرف بچی جگہ پر سونا ناممکن تھا تکیہ اٹھا کر وہ صوفے کی طرف آگیا۔ مگر یہاں سونے کی ساری کوششیں بے کار گئی تھیں صوفے سے نیچے لٹکتی ٹانگوں سمیت اس جگہ سونا کرتب دکھانے کے مترادف تھا۔

دن بھر کی تھکاوٹ کے ساتھ اس کا اس طرح سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تکیہ کارپٹ پر پھینک کر وہ بیڈ کے پاس آیا اور احتیاط سے ایک طرف لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہاں اور مشکل تھی یہاں اور اس کے سانسوں کی ہلکی آواز بری طرح ڈسٹرب کر رہی تھی۔ ساری سوچیں گھوم پھر کر قریب سوئے وجود پر مرتکز ہو جاتی تھیں۔ وہ اس کا رویّہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ باقی سب کے ساتھ اس کا رویّہ بہت اچھا تھا۔ وہ ہنستی تھی سب کا خیال رکھتی تھی یعنی زبردستی والا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ ایک وہی تھا۔

"کیا وہ اسے ناپسند کرتی تھی اتنا کہ دیکھنا تک گوارا نہیں تھا۔" کیا گرہ تھی اس کے ذہن و دل میں جو کھل کے نہ دے رہی تھی۔ "کیا وہ اس بات پر ناراض تھی کہ ساری زندگی انہوں نے پوچھا تک نہیں تھا۔ اگر ایسا تھا تو پھر اسے بابا کے ساتھ بھی ایسا ہی رویّہ رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن بابا کے ساتھ اس کا رشتہ اور تھا اور اس کے ساتھ اور' ہاں شاید یہی وجہ ہے۔"

کتنی دیر سے وہ اسے سوچے جا رہا تھا۔ تھکاوٹ کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ انسان تھا پہلو میں دھڑکتا دل رکھتا تھا جو اسے محسوس کرنا چاہتا تھا آنکھیں رکھتا تھا جو اسے دیکھنا چاہتی تھیں مگر اس کے رویّے کی بدولت اس نے خود کو کسی بھی پیش قدمی سے روک رکھا تھا۔ کبھی اس پر شدید غصہ سوار ہو جاتا۔

"وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔"

اس کی آنکھیں بند تھیں پر دل و دماغ اسے سوچ رہے تھے اچانک ایک نرم گرم ہاتھ اس کے گال پر آن ٹھہرا اس نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا وہ اس کی شیو کا کھردرا پن محسوس کر چکی تھی شاید وہ اسے بے۔جی سمجھ رہی تھی۔ کجلائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے اس نے ہاتھ کھینچنا چاہا جب اس نے ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی وہ اس وقت اس کے یہاں ہونے کی توقع بالکل نہیں کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کے نیچے اس کی دھڑکنوں کا ارتعاش اس کے ہاتھ کو بھی مرتعش کر رہا تھا۔

"وہ..... میں..... بے۔جی۔"

ہمیشہ کی طرح اس کے منہ سے بے ربط جملے نکلے تھے۔

"اوہ میں سمجھا شاید میرے نقوش میں کچھ ہی گھنٹوں میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے اس لیے کچھ ناپ تول ہو رہا ہے۔ کہیں تو لیمپ آن کر دوں اچھی طرح غور و فکر کر لیں سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے جیسا کچھ گھنٹے پہلے تھا۔"

اس کی دھیمی' گمبھیر و نرم آواز اس کے کان کے پاس سرسرا رہی تھی اس کے لہجے میں نہ رعب تھا نہ مذاق اور نہ ہی طنز۔ لیکن اس سچویشن پر اس کی جان پر ضرور بن آئی تھی عجیب مشکل میں گرفتار تھی وہ۔ اس حرکت کا کوئی جواز سرے سے اس کے پاس موجود نہیں تھا۔ امی کے ساتھ سوتے کئی بار وہ ان کے چہرے پر ہاتھ لگاتی اب بے۔جی کے ساتھ..... شرمندگی سے پلکوں پہ منوں بوجھ آن گرا۔ کمرے کا خوابناک ماحول اس پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس سے عجیب سی شرم محسوس ہو رہی تھی دل کانوں میں دھڑک رہا تھا چہرہ سرخ ہو کر تپ رہا تھا۔

وہ ابھی تک اس کے ہاتھ کو تھامے ہوئے تھا۔ جلدی سے ہاتھ کھینچتے وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی اور پھر کمرے سے ہی باہر نکل آئی۔ لمبے لمبے سانس لیتے وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہاتھ کے نیچے ابھی تک اس کی دھڑکنوں کا ارتعاش اور اس کا لمس موجود تھا وہ اس کا شوہر تھا اس پر شرعی' قانونی اور معاشرتی ہر لحاظ سے حق رکھتا تھا لیکن تنہائی کے لمحوں میں بھی اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جو اسے بری لگتی۔ لیکن وہ ایک کانٹا جو دل میں گڑا تھا نکلنے نہ پا رہا تھا۔ اگر اس رات وہ نہیں تھا تو اور کون تھا۔ یہ اور اذیت ناک بات تھی۔ آج ارادی طور پر وہ فائقہ کی مہندی کو سوچ رہی تھی۔

وہ فائقہ کے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے اس کی سہیلیوں کو لانے سے انکار کیا تھا۔ فائقہ ناراض تھی پھر..... فائقہ کی ناراضگی پر اس کا شگفتہ انداز..... فائقہ نے ضیاء کا نام لیا تھا۔

"میں ضیاء سے کہہ دیتی ہوں۔"

اسے ابھی تک اس کے جملے من و عن یاد تھے۔ رات کے اس پہر اس کا جی چاہا وہ فائقہ کو فون کرے ابھی اسی وقت۔ دل کی بے چینی حد سے سوا تھی وہ اس سے کیا پوچھے گی اس نے خود سے پوچھا کئی بار پہلے بھی اس سے بات ہو چکی تھی۔ مگر اس کی شادی کے تذکرے سے وہ خود کنی کترا جاتی تھی۔ تیمور کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ اس کی طرف کھنچ رہی تھی۔

"تیمور ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔"

اس کے دل سے آواز آئی تھی لیکن دل کی آواز کو ذہن نے کئی دلائل دے کر رد کر دیا تھا۔

"فائقہ کب آ رہی ہو میں تمہیں بہت مس کر رہی ہوں۔"

رات اس نے جانے کس طرح بتائی تھی۔ اسے فون کرتے وہ واقعی اسے مس کر رہی تھی۔ اس کا حال پوچھنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

"جب یہاں تھی تب تو بات کرنا گوارا نہیں تھا اور اب مس کر رہی ہوں کب آؤ گی۔"

فائقہ نے اس کی نقل اتاری وہ حق بجانب تھی۔

"اب معاف بھی کر دو اس غلطی کو ساری عمر طعنے دیتی رہو گی کیا۔ طبیعت اتنی خراب نہ ہوتی تو میں اور تمہاری شادی اٹینڈ نہ کرتی۔"

وہ پہلی بار کھل کر اس موضوع پر بات کر رہی تھی۔

"ہاں سب کی طبیعتوں کو میری شادی پر ہی خراب ہونا تھا ایک وہ فریہ اس کی طبیعت بھی خراب تھی۔"

فائقہ ابھی تک تپی ہوئی تھی۔ جس نہج پر وہ سوچ رہی تھی بات ادھر ہی جا رہی تھی۔

"وہ رخ اور وہ آنسہ وہ تو آئی تھیں تمہاری شادی میں؟"

ڈرتے ڈرتے پوچھتے اسے خود بھی پتا نہیں تھا وہ کیا جاننا چاہتی تھی۔

"وہ بھی تیمور بھائی کی مہربانی تھی جو جا کے لے آئے تھے ان بے چاریوں کو۔ اس ضیاء کے بچے کو تمہارے سامنے فون کیا تھا میں نے اس وقت مجھے کہا کہ میں ابھی آ کر تمہاری بات سنتا ہوں نہ وہ آیا نہ مجھے یاد رہا اور صبح تیمور بھائی کو ہی جانا پڑا لینے کے لیے۔" اس بات پر اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ تیمور اس کے نکلنے سے کئی منٹ پہلے جا چکا تھا۔

"تو کیا ضیاء۔"

سوچ' سوچ کر اس کے دماغ میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ معمہ ابھی تک معمہ ہی تھا۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اس نے کمرے میں قدم رکھا اور کمرے میں ہلکے سروں میں بجتے میوزک کو سن کر حیرت زدہ رہ گئی اسے اس سے اتنے اچھے کلیکشن اور ٹیسٹ کی توقع نہیں تھی۔

"سونے دی تو تیڑی" یا "کالا جوڑا پایا" جیسے گانے سننے کی اس سے توقع تو کی جا سکتی تھی پر..... ناکام عاشقوں کی طرح غزلیں سنتے اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ آج خلاف توقع وہ سارا دن گھر میں موجود رہا تھا اور کمرے میں گھس کر نہ جانے کیا کر رہا تھا۔

نہانے کے لیے اپنے کپڑے نکال کر استری کرتے اسے حیرت کا دوسرا اور شدید جھٹکا لگا تھا۔ میوزک کی آواز مزید آہستہ کرکے وہ انگلش میں بات کر رہا تھا۔

"جی براؤن صاحب، بہت بہت شکریہ، جی مشینیں پہنچ گئی ہیں نہیں ابھی کام تو شروع نہیں ہوا امید ہے ایک دو مہینوں تک شروع ہو جائے گا۔ انہیں ابھی تو آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

اپنا کام چھوڑ کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ انگلش بولتے وہ کسی طرح بھی اجڈ تیمور نہیں لگ رہا تھا۔

"سروییم ٹھیک ہیں۔ اپنا بہت سا خیال رکھیے گا۔ بائے۔"

اس کے فون بند کرنے سے پیشتر وہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

"کیا میں اتنی ہی بے وقوف ہوں ابھی تک اس کی تعلیم بلکہ کسی بھی معاملے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔"

"یار جب لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ کیوپڈ کا تیر کام کر گیا لیکن اس معاملے میں مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کہوں بلکہ کیا کہا جانا چاہیے۔ ادھر وہ ڈنگر...... ڈاکٹر صاحب ارم بی بی پر فریفتہ ہوئے اور ادھر ارم بی بی کے والدہی تمہارے حشمت انکل ڈنگر ڈاکٹر کی ڈگریوں اور ٹنڈ پر چاروں شانے چت ہو گئے۔"

معیز کی باتوں پر بے اختیار اس نے منہ پھاڑ کر قہقہہ لگایا۔ نہا کر کمرے میں قدم رکھتے اس نے اس جناتی قہقہے کے ماخذ کو دیکھا وہ ناکام عاشق تو کہیں سے بھی نہیں دِکھ رہا۔ صبح سے شاید وہ یہی کام کر رہا تھا۔ اب وہ کسی اور سے محو گفتگو تھا۔

"بالا ہی بالا سارے معاملات طے کیے بیٹھا ہے وہ ڈنگر ڈاکٹر میں نے سوچا تجھے بتا دوں پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی سارا چکر تمہارے ولیمہ پر چلا۔"

"جو خبر تو مجھے آج بتا رہا ہے وہ مجھے پہلے ہی پتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حشمت انکل نے اس کے بارے میں سب سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے سب کچھ اوکے کر دیا۔"

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے ہاتھوں پر کریم ملتے "حشمت انکل" پر اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے سے اس نے تیمور کو دیکھا وہ فون سنتے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے بلاوجہ سامنے پڑی چیزیں الٹنی پلٹنی شروع کر دیں۔

نہ جانے حشمت انکل کا ذکر کیوں ہوا تھا۔ کس سے بات کر رہا تھا وہ۔

اس کی اگلی باتیں سننے کے لیے وہ وہیں کھڑی رہی۔ تیمور کے کمرے میں موجود ہوتے یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی دیر وہاں موجود رہی تھی۔

"دیکھو شاید اگلے ایک دو مہینوں کی تاریخ رکھی جائے۔"

وہ کتنی دیر وہیں موجود رہی تھی پھر اس کی نظروں کے ارتکاز سے گھبرا کر باہر نکل آئی کسی بات کا سرا ہاتھ نہ آیا تھا۔

"خود ہی پوچھ لیتی تو بہتر تھا۔"

"بے جی کچھ کپڑے اور سامان گاڑی میں پڑا ہے نکلوا کر کمرے میں رکھوا دیں اور ایک کپ چائے کا بھی بھجوا دیں۔"

وہ چاروں باتوں میں مصروف تھیں ۔ بے جی اور امی پرانے رشتے اور رشتے داریاں ڈسکس کرنے میں مشغول تھیں ۔ وہ اور مزنہ اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ صبح یہی کہیں نکل گیا تھا نہ اس نے جاننے کی کوشش کی تھی نہ اس نے بتانے کی ضرورت سمجھی تھی۔ نیلی جینز اور پنک ٹی شرٹ میں وہ تھکا تھکا سا دکھائی دیا تھا۔

"پہلے کھانا تو کھالو۔"

کمرے میں جاتے بے جی نے اسے آواز دی۔

"کھانا نہیں بس چائے بھجوا دیں تھوڑی حرارت سی محسوس ہو رہی ہے۔" وہ کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

"سلویٰ دیکھ تو سہی چل کے کتنا بخار ہے۔ اسے تو کبھی بخار ہوا ہی نہیں جانے کن کاموں میں لگا ہوا ہے آج کل۔ نقشے پھیلائے جنے کیا کرتا رہتا ہے دن رات۔

کئی بار منع کیا ہے اتنا کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی میری سنے بھی تو۔"

فکر مندی سے کہتے وہ کھڑی ہو گئیں۔

"کدھر ہے تمہارا دوائیوں والا ڈبا۔"

اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے وہ آگے آگے چلنے لگیں۔ مرتی کیا نہ کرتی کہ مصداق مردہ قدم اٹھاتی وہ ان کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ان ہی کپڑوں میں بیڈ پر دراز تھا۔

"بے جی بخار تو نہیں شاید تھکاوٹ ہے۔"

آنکھوں پر رکھا بازو ہٹا کر اس نے بے جی کے ساتھ اسے کھڑے دیکھا۔

"تو ڈاکٹر تھوڑی ہے۔ دیکھ سلویٰ پتر کیسے ماتھا تپ رہا ہے۔"

انہوں نے سلویٰ کا ہاتھ پکڑ کر اس کی پیشانی پر دھر دیا۔ واقعی ماتھا تپ رہا تھا۔ تھرمامیٹر سے چیک کرنے پر واقعی بخار تیز تھا۔

"بے جی آپ بھی بس، کچھ نہیں ہوا مجھے۔"

اس کی تھکی بے زار آواز پر اس نے جھکی آنکھوں کو اٹھایا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا چہرے پر حد درجہ بے زاری رقم تھی۔

"بے جی آپ چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو بھیجیں میں انہیں میڈیسن دے دیتی ہوں۔"

یہ ایک ذمہ دار ڈاکٹر کا انداز تھا۔

"آپ پلیز آرام وہ کپڑے پہن کر ایزی ہو جائیں میں آپ کے کپڑے نکال دیتی ہوں۔"

وہ اس کی وارڈ روب کی جانب بڑھی جسے اس نے اب تک کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

"آپ تکلیف نہ کریں میں خود ہی نکال لوں گا۔"

لہجے میں تلخی تھی یا کچھ اور وہ سمجھ نہیں پائی تھی بہرحال ایک آرام وہ سوٹ نکال کر باتھ روم میں ضرور لٹکا دیا تھا۔ اس کے لائے کپڑے اس کی وارڈ روب میں سیٹ کرتے وہ اسے دیکھ رہی تھی وہ دوا کے زیر اثر سو چکا تھا۔

وہ اس سے کچھ پوچھتا کیوں نہیں؟

جھلا کر اس نے الماری بند کی اور باہر نکل آئی۔

"زیادہ ویلا (دیر) ہو گیا ہے۔ آج نہ جاؤ کل چلے جانا رات ہو جائے گی رستے میں۔"

بے جی کی فکر مندانہ آواز پر اس نے تیمور کی طرف دیکھا وہ گاڑی کی طرف بڑھتا بے جی کی طرف آ گیا۔

"بے جی آج اس کی مہندی ہے اگر آج نہ گئے تو اس نے میرا بڑا برا حال کرنا ہے۔ رات تو نہیں ہو گی۔ جلدی پہنچ جائیں گے۔"

بے جی کو تسلی دے کر وہ اس کا انتظار کرنے لگا جو ابھی کمرے سے باہر نکلی تھی اور پھر واپس چلی گئی تھی۔

"تمہارے بابا کی طبیعت ٹھیک ہوتی تو ہم بھی ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔" ارم اور حماد کی شادی کی تاریخ رکھی گئی تھی۔ مزنہ اور امی پہلے ہی لاہور میں تھیں مزنہ کے پیپر ہو رہے تھے ایک دو دن پہلے ہی ختم ہوئے تھے۔ ارم نے اسے دیر سے بتایا تھا اس کی خوشی دیدنی تھی۔ ہسپتال جوائن کیے اسے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ بہت ایکسائیٹڈ تھی ارم ارجمند سے کافی دیر بعد ملاقات ہو رہی تھی۔

اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے اسے اس کی گاڑی میں پہلی بار بیٹھنا یاد آیا تھا وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا باہر اندھیرے کو گھورتے اسے نہ جانے کب نیند آ گئی تھی۔

"سلویٰ، سلویٰ۔"

وہ اس کا کندھا ہلا رہا تھا۔ حشمت انکل کے گھر کی چمکتی روشنیاں سامنے تھیں دروازہ کھول کر وہ تیزی سے نیچے اتری پھر کچھ خیال آنے پر پیچھے مڑی۔

"آپ اندر نہیں آئیں گے۔"

وہ ابھی تک گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا سر ہلا کے وہ اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"بات سنیں۔"

عمارت میں داخل ہونے سے پہلے دائیں طرف سے اس کی آواز آئی تھی۔

اس نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔

"حماد میرا بہت اچھا دوست ہے کئی بار کھانے پر بلا چکا ہے تیار ہو جائیں تھوڑی دیر کے بعد اس کی طرف چلنا ہے پھر جاہے واپس آجایئے گا۔"

اس کے کہنے پر اس نے سر ہلا دیا تھا۔

"میرے ولیمہ میں کیا کیا ہوتا رہا اگر بے خبر رہی تو میں۔"

ارم کو گھورتے وہ اس کے سرخ ہوتے چہرے کا مزا لے رہی تھی۔

"قسم لے لو جو میں نے انہیں دیکھا ہو۔ مجھے پتا نہیں انہوں نے مجھے۔"

"اوہو یعنی اب "انہیں انہوں" سے ادھر بات نہیں ہو رہی۔"

وہ ارم کی نروس نیس کا بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔

"اچھا ہوا جو تم نے "انہیں" نہیں دیکھا ورنہ شاید حالات یہاں تک نہ پہنچ پاتے۔"

یہ ارجمند تھی جو سنجیدگی اور معنی خیزی سے کہتی مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا گئی۔ وہ کئی بار پہلے بھی حماد کی سانولی رنگت اور کم ہوتے بالوں کے بارے میں ارم کو آگاہ کر چکی تھی۔

"سلویٰ تم نے تو دیکھا ہوگا حماد کو؟"

ارم اب سلویٰ کے سر تھی نہ جانے وہ اس سے کیا سننا چاہتی تھی۔ روہانسی آواز پر سلویٰ کو اس پر ترس آ گیا۔ ارجمند کو پرے دھکیلتے وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"دیکھا تو نہیں ہاں تیمور سے اتنی تعریفیں سنی ہیں کہ تمہیں خوش قسمت سمجھنے لگی ہوں۔ اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔"

اس کے سارے کپڑے بے جی نے رکھے تھے مہندی کے لیے خاص اس کی شادی کا لہنگا رکھا تھا اور تاکید کے ساتھ پہننے کے لیے بھی کہا تھا۔

"اب تو ویاہی کڑی ہے۔ تجھے کوئی چیج (اچھا) کا کپڑا پہنے نہیں دیکھا میں نے جو میں نے تیرے لیے رکھے ہیں نا وہی پہننے ہیں تو نے میں فہمی سے پوچھ لوں گی بعد میں، سنا تو نے۔"

سرخ لہنگا جگر جگر کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے اسے پہن لیا۔ تیمور کے دو پیغامات آ چکے تھے انہیں تھوڑی دیر کے لیے حماد کی طرف جانا تھا۔ سرخ رنگ میں اس کا گورا رنگ دمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر قبل اس نے اس سے بھی کپڑے بدلنے کے متعلق پوچھا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔

اسے بھاری لہنگے کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے دیکھ کر وہ دیکھتا ہی رہ گیا تھا ہلکے میک اپ کے ساتھ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ جذبات میں ایک تلاطم سا برپا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ شاید اردگرد سے بھی غافل ہو چکا تھا۔

"لگتا ہے تیمور بھائی آج پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ چلتی مزنہ نے کی تو سرگوشی ہی تھی مگر سلویٰ کے ساتھ تیمور بھی خجل ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اس کے پیچھے سہج سہج قدم اٹھاتی وہ لہنگا سنبھال رہی تھی۔ ایک دم نہ جانے کیا ہوا تھا وہ مڑا، اس کا بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا انیکسی میں لے آیا۔ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ عجب خوفناک تیور تھے اس کے۔

"اس فضول ڈریس کے علاوہ آپ کے پاس کوئی اور ڈریس نہیں ہے۔ میں باہر گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں دس منٹ میں ڈریس تبدیل کر کے آجائیں۔"

"کیوں کیا ہوا ہے اسے۔"

اس کے مڑنے سے قبل ہی اس نے بھی جارحانہ تیوروں سے پوچھا۔

"جس دن اس کو پہننے کی ضرورت تھی اور جس کے لیے اسے پہننا تھا اس کے لیے تو آپ ایک گھنٹا بھی انتظار نہ کر پائی تھیں۔ آج کیا لوگوں کے لیے پہنا ہے۔"

سلگتی نگاہوں سے اسے گھورتے وہ سوچ رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک ان نگاہوں کا سامنا نہیں کر پائی تھی بغیر جواب دیے وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا اور وہ بغیر کچھ بھی کہے دوسرے کپڑے پہننے لگی۔ کیسے تاثرات تھے اس وقت اس کے سلویٰ کے سارے غصیلے جذبات کہیں جا سوئے تھے۔

"پہلے اسکول میں ساتھ تھے۔ کالج میں تو ساتھ رہے ہاں آکسفورڈ میں بھی ملاقات ہوتی رہی۔ اس کی فیلڈ اور میری فیلڈ میں فرق تھا پر دوستی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔"

حماد خوش گوار موڈ میں سلویٰ کو بتا رہا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے سن رہی تھی حماد اپنی امی سے اس کا تعارف کروا رہا تھا جب اچانک لائٹ چلی گئی اس نے گھبرا کر ساتھ کھڑے تیمور کا بازو تھام لیا۔ اچانک ہی ہوا تعمیہ یاد کے پردے پر لہرا گیا تھا۔

"تیمور۔"

"شفیق جنریٹر آن کرو۔" حماد کی دور ہوتی آواز آئی تھی۔

"نادیہ موم بتیاں یا ایمرجنسی لائٹ آن کرو۔"

حماد کی امی بھی شاید دور چلی گئی تھیں۔

"میں ادھر ہی ہوں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس کے بے اختیار گھبرا کر آواز دینے اور بازو تھامنے پر وہ محسوس کر چکا تھا کہ وہ گھبراہٹ کا شکار ہے۔ اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ پر اس نے اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔ لائٹ جلدی آگئی تھی لیکن وہ اس وقت سے سوچ رہی تھی جس شخص کو وہ اپنے عدم تحفظ کی وجہ سمجھتی تھی اسی سے تحفظ کی خواہاں بھی تھی اسے قریب پا کر اسے اس سے نہ کسی اور سے خوف محسوس ہوا تھا۔

"ہاں میں اور سلویٰ لاہور میں ہی موجود ہیں۔ تم گھر ہی ہو اس وقت تھوڑی دیر تک تمہاری طرف آنے کا ارادہ ہے۔ یار کیوں بابا کو تنگ کر رکھا ہے۔ تمہاری ہر بات مان چکے ہیں اب ایک نیا کھڑاگ لے کر ان کے سامنے آگئے ہو۔ کیا چکر ہے اٹلی کا۔"

حماد کی شادی سے فارغ ہو کر اس کا ارادہ ضیاء کی طرف جانے کا تھا۔ اسے پہلے فون کر دیا تھا تاکہ سلویٰ کے ساتھ اس کی طرف جاتے شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چچی اور مزنہ کا ابھی یہاں ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ مزنہ کے پریکٹیکل ہونے والے تھے ان دونوں کا ارادہ مکمل فارغ ہو کر آنے کا تھا۔ ضیاء کی کسی ایک

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیئر آئل

SOHNI HAIR OIL

☆ گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے۔
☆ نئے بال اُگاتا ہے۔
☆ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
☆ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید۔
☆ ہر موسم میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سوہنی ہیئر آئل قیمت=/70 روپے

12 جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہٰذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدا جا سکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف =/70 روپے ہے، دوسرے شہر والے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

1 بوتل کے لئے ---------- =/90 روپے
2 بوتلوں کے لئے ---------- =/160 روپے
3 بوتلوں کے لئے ---------- =/240 روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیئر آئل ان پتوں سے حاصل کریں۔

بیوٹی بکس 53 اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 2735021

جگہ نہ ٹھہرنے والی عادت آج کل پھر سب کو پریشان کیے ہوئے تھی۔ اٹلی آرٹ یونیورسٹی میں اس کا ایڈمیشن ہو چکا تھا۔ اس کے جانے میں کچھ ہی دن رہ گئے تھے یہ بھی مقام شکر تھا کہ اس نے بتانے کی زحمت گوارا کرلی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ اس کی بات سنے گا لیکن وہ آخری کوشش کر لینا چاہتا تھا۔ بابا کا کہنا تھا وہ اگر چلا گیا تو پھر اس کا واپس آنا مشکل ہے اور یقین تو خود تیمور کو بھی یہی تھا۔ وہ سلویٰ کو ساتھ لانا نہیں چاہتا تھا پر مشکل یہ تھی کہ آج ان کا یہاں آخری دن تھا اور ضیاء سے ملنے کے بعد سلویٰ کو بے.جی کی بتائی چیزوں کی شاپنگ کرنا تھی اور مارکیٹ ضیاء کے فلیٹ کے بالکل قریب تھی۔

"کیسے ہو۔" تیمور گرمجوشی سے ضیاء کے گلے لگا پوچھ رہا تھا۔

"فائن ہیر۔" ایک طرف صوفے پر بیٹھتے سلویٰ نے اس کے انداز میں سرد مہری محسوس کی تھی۔ ضیاء کے ہاتھ سے کوک لیتے اس نے وہی بھولی بسری بو جو اس رات اس کا منہ دبانے والے کے ہاتھوں سے آ رہی تھی محسوس کی تھی۔ شاید وہ کچھ پینٹ کرتے کرتے اٹھ آیا تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف تھے اور وہ مسلسل اپنی بے وقوفی کو کوس رہی تھی۔ وہ بو یقیناً پینٹ کی تھی اور وہ چور کی سزا کسی اور کے کھاتے میں ڈالتی آئی تھی۔ وہ نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے اس نے ایک لفظ بھی نہیں سنا تھا اس کا دماغ تو الجھن کے سلجھ جانے پر ورطۂ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے باہر گاڑی میں ہوں میں۔ میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔"

نفرت اور کراہیت بھری نظر ضیاء پر ڈال کر وہ باہر نکل آئی۔ ایک طرف شرمندگی تھی جو اسے تیمور کے سامنے سر نہ اٹھانے دیتی تھی وہ اسے کیا سمجھتی رہی تھی اور اس صاف دل شخص نے اس کے برے رویّے پر ایک بار بھی اسے کچھ نہیں کہا تھا ایک ایک کر کے اسے اپنی ساری کوتاہیاں یاد آ رہی تھیں۔ دوسری طرف ضیاء کی حرکت سے وہ خود کو ایک دم عدم تحفظ کا شکار سمجھنے لگی تھی۔ ہاں اس کے جانے کا سن کر بے چینی خود ہی ختم ہو گئی تھی۔ شاید وہ خود بھی احساس گناہ کا شکار تھا اسی لیے جا رہا تھا یا وجہ کچھ اور تھی بہرحال اس کے لیے مقام شکر تھا کہ اس شخص کو یہاں نہیں رہنا تھا یہاں رہتے حویلی آنے پر اس پر پابندی عائد نہیں کی جا سکتی تھی۔

★ ★ ★

اس کے بدلے بدلے انداز اس سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اس کے ہوتے کمرے میں موجود ہونا اور کبھی کبھار اسے بلانے کی کوشش، وہ اسے بالکل سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"آپ کو پتا نہیں بے.جی بابا کے بعد ہم نے کیسی زندگی گزاری ہے۔ امی لوگوں کے کپڑے سیتی رہی ہیں اور میں اور مزنہ نے بھی بہت محنت کی ہے۔ پیچھے مڑ کے دیکھتی ہوں تو یہ سب کچھ ایک فریب، گورکھ دھندہ لگتا ہے۔ جس وقت ہمیں ضرورت تھی اس وقت اور اب جب کہ میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی ہوں اس وقت......"

وہ بے.جی کے کمرے کے دروازے سے ہی واپس مڑ گیا۔

جو بات وہ سوچتا تھا وہی بات تھی۔ وہ دل میں کیسا غبار لیے بیٹھی تھی اور اس نے اس سے پوچھنا تک گوارا نہیں کیا تھا کیسی محبت تھی یہ۔ وہ اپنی جگہ حق بجانب تھی وہ بے.جی یا بابا کی ذمہ داری نہیں تھی ذمہ داری تو وہ اس کی تھی جو ابھی تک اس سے یہ بھی پوچھ نہیں پایا تھا کہ اس کے رویے کی کیا وجہ ہے اگر آج خود ہی پتا نہ چل جاتا۔

بے.جی سے بات کرتے اس کا موضوع نہ جانے کیا تھا مگر وہ اسے اپنی کوتاہی شمار کر رہا تھا۔

"صرف حشمت انکل کو ہی بتا دینا کافی نہیں تھا بلکہ وہ تو خود بھی جانتے تھے۔ اصل میں تو اسے سلویٰ کو بتانا چاہیے تھا پاپا کی وفات ان کے گھر کی تبدیلی، تو اسی لیے وہ متنفر تھی؟؟"

تیمور اور بابا سیاسی ایشوز پر گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک وہ اتنے بور ٹاپک کے باوجود وہیں الجھی رہی تھی لیکن ان کی نہ ختم ہونے والی بحث سمیت انہیں وہیں چھوڑ کر وہ کمرے میں آ گئی۔ میڈیسن کے متعلق موٹی سی کتاب پڑھتے اسے وقت گزرنے کا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔

"آج اس جگہ پر اگنے والے ببول کے کانٹے اور خار مغیلاں کی جگہ کیا پھولوں نے لے لی ہے یا اچانک ان کی چبھن ختم ہو گئی ہے۔"

تیمور کو اندر آتے اس نے ضرور دیکھا تھا لیکن کتاب میں گم ہونے کی بدولت اسے یہ بالکل احساس نہیں ہو سکا تھا کہ وہ بیڈ کے عین وسط میں آلتی پالتی مارے بیٹھی ہے۔ اس پھانس کے نکل جانے سے وہ بہت ریلیکس تھی اسی لیے ادھر دھیان نہیں گیا تھا۔

اس کے لب و لہجے اور انداز پر اسے بے اختیار ہنسی آئی جسے اس نے روکنے کی کوشش بالکل نہیں کی تھی۔

"کانٹوں کی جگہ پھولوں نے لی ہے یا نہیں اس کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتی ہاں ایک بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر طنز پر کوئی ڈگری کسی یونیورسٹی میں ملتی تو آپ کو ضرور پی ایچ ڈی طنز پر اعزازی ڈگری دے دی جاتی۔ کمال کا طنز کرتے ہیں آپ۔"

اس کے بھرپور شرارتی انداز اور مسکراتے چہرے کو دیکھ کر وہ ایک دم ہی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھتے وہ نیچے اتر آئی۔

"اگر تو میں اور بھی بہت کچھ سکتا ہوں یہ اور بات ہے۔"

سنجیدہ چہرے کے ساتھ انداز میں بلا کی معنی خیزی تھی وہ ٹپٹا کر وہیں رک گئی چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"پہیلی کے ساتھ ساتھ کیا تم بھی یہی سمجھتی ہو کہ تم لوگوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔"

اس کے یکدم بات بدل دینے پر اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

"پہلے سمجھتی تھی اب نہیں مجھے پتا چل گیا ہے کہ تایا ابا کی وفات بھی ان ہی دنوں ہوئی اور پھر آپ کا تلاش کرنا اور حشمت انکل کا باہر چلے جانا۔"

"اب کیا سمجھتی ہیں۔"

چہرہ ہنوز سنجیدہ تھا پر انداز اور لہجے سے شوخی ٹپک رہی تھی۔

"کہ آپ کی کوششوں کی بدولت ہم یہاں ہیں۔ امی کو مقام اور ہمیں محبت صرف آپ کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔"

اس کے شوخ انداز کے باوجود جواب نہایت سنجیدگی سے دیا گیا تھا۔

"کس کی محبت......" وہ بات سے بات نکالتا اسے زچ کرنا چاہ رہا تھا۔ زیرِ لب مسکراہٹ گہری ہو رہی تھی۔

"بے.جی اور بابا۔" اسے جواب دے کر اس نے قدم باہر کی جانب بڑھا دیے جب وہ اچانک سامنے آ گیا۔

"اور عینک والا جن کدھر گیا۔"

سلویٰ کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو تھیں۔

"آپ۔" شرمندگی سے وہ کچھ بھی بول نہ سکی۔ پہلی ملاقات جو یاد آ گئی تھی۔

"جی عینک والے جن عرف نستور عرف تیمور نے سبز پری کی محبت کی پہلی نشانی کو سنبھال کر اس وقت سے سینے سے لگا رکھا ہے۔"

دراز کھول کر اس نے فریم شدہ اسکیچ اس کے سامنے کر دیا۔ اس کی محبت پر جہاں وہ مسکرائی تھی وہیں اردگرد ہر چیز مسکرا رہی تھی۔ دھندلے آئینے پر پڑی گرد صاف ہو چکی تھی اور ہر چیز اپنی واضح آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو رہی تھی۔

☆ ☆